محمود • فاروق • فرزانہ

اور — انسپکٹر جمشید سیریز

ناول نمبر ۳۶۵

نیلے چاند کی موت

اشتیاق احمد

ناول پڑھنے سے پہلے یہ دیکھ لیں کہ:

- یہ وقت نماز کا تو نہیں —
- آپ کو سکول کا کوئی کام تو نہیں کرنا —
- کل آپ کا کوئی ٹسٹ یا امتحان تو نہیں —
- آپ نے کسی کو وقت تو نہیں دے رکھا —
- آپ کے بڑے گھر والوں نے کوئی کام تو نہیں لگا رکھا۔

اگر ان باتوں میں سے کوئی ایک بات بھی ہو تو ناول الماری میں رکھ دیجیے۔ پہلے نماز اور دوسرے کاموں سے فارغ ہو لیجیے، پھر ناول پڑھیے۔ شکریہ!

فقط:

اشتیاق احمد

اکڑی ہوئی لاش

سر ابدال خان نے جونہی آئینے میں اپنے چہرے کو دیکھا، وہ زور سے اچھلے:

"بیگم — یہ کیا شرارت ہے۔" وہ چلائے۔

"شرارت — کہاں ہے شرارت۔" ان کی بیگم نے باورچی خانے سے جواب دیا، جب کہ وہ باہر برآمدے میں تھے — اور کنگھا کرنے کے لیے آئینے کے سامنے کھڑے تھے، کنگھا ان کے ہاتھ میں تھا اور کنگھے والا ہاتھ اٹھا کا اٹھا رہ گیا تھا، وہ اس ہاتھ کو نیچے گرانا تک بھول گئے تھے۔

"تو! اب میں یہ بتاؤں کہ شرارت کہاں ہے — بیگم شرارت۔"

"کیا کہا — بیگم شرارت۔" بیگم چلائیں۔

"نہیں! تم بیگم شرارت کس طرح ہو سکتی ہو — میں تو یہ کہہ رہا تھا کہ بیگم — شرارت، ہمارے کسی بچے کا نام نہیں ہے کہ میں تمہیں بتا دوں — شرارت کہاں ہے — ویسے تو میں اپنے

بھی بچے کے بارے میں بتا ہی نہیں سکتا کہ اس وقت
کہاں کہاں ہو گا۔"

"توبہ ہے آپ سے — آخر بات کیا ہوئی؟" وہ چلائیں

"یہاں آ کر دیکھو — میرے چہرے پر۔"

"یا اللہ رحم — کیا ہو گیا ہے، آپ کے چہرے پر — ذ
دیکھوں تو سہی۔" یہ کہہ کر وہ جلدی سے باہر نکلیں اور ان کے
پر نظر ڈالی — دوسرے ہی لمحے وہ بھی زور سے اچھلیں

"ارے! یہ نشان کیسا ہے — چاند جیسا نشان — لیکن نیلا
کا — گویا نیلا چاند — یا نیلا نشان۔"

"تت — تو یہ تم نے نہیں بنایا۔" انھوں نے بوکھلا کر کہا۔

"میں اتنی اچھی آرٹسٹ نہیں ہوں۔"

"ارے ہاں! یاد آیا — ہمارے گھر میں ہماری
ب سے اچھی آرٹسٹ ہے — بیٹی ہما — ذرا ادھر تو آ
نے ہانک لگائی۔

"جی ابو — کدھر آؤں؟" ہما نے اپنے کمرے سے آواز

"بس یہیں آ جاؤ — جہاں میں موجود ہوں — آ
سامنے۔" وہ بولے۔

"جی ابھی آئی — لیجیے آ گئی۔"

"بیٹی! یہ تم نے بنایا ہے؟" انھوں نے اپنے دائیں

پر بنے نشان کی طرف اشارہ کیا۔

"ارے! یہ کیا ہے؟" اس نے حیران ہو کر کہا۔

"نیلا چاند۔" بیگم نے بُرا سا منہ بنایا۔

"نن — نیلا چاند — گگ — کیا مطلب؟"

"ابھی نیلے چاند کا کوئی مطلب نہیں بتایا جا سکتا۔" بیگم
نے کہا۔

"اس کا مطلب ہے — یہ چاند اس نے نہیں بنایا۔"

"ہمارے گھر میں تو کوئی بھی اتنا اچھا چاند نہیں بنا سکتا۔"
ہما نے پریشان ہو کر کہا۔

"اوہو! میں کہتی ہوں — دھو ڈالیے — معلوم ہو ہی جائے
گا، یہ کس کی شرارت ہے — آپ لیٹ ہو جائیں گے — جہاز
نکل جائے گا آپ کا — اگر آپ نے ایک ایک کو بلا کر پوچھا —
یہ بات ذہن میں رکھیے کہ ہمارے پورے گیارہ بچے ہیں۔"

"ارے باپ رے — یہ تو میں بھول ہی گیا تھا — اب تو
اس کو دھو ڈالنا ہی مناسب رہے گا۔"

"بالکل ٹھیک ابو — میں اچھی بھلی سکول کی تیاری کر رہی تھی۔"
ہما نے کہا اور واپس مڑ گئی —

"تو اب پھر جا کر اچھی بھلی تیاری کر لو — کس نے کہا ہے،
بُری بھلی تیاری کرنے کو۔" سر ابدال خان نے خوش ہو کر کہا۔

وُہ نہایت مزاحیہ طبیعت آدمی تھے۔ گھر میں ہر وقت ہنستا ہنساتا لگا رہتا تھا۔ آج انھیں ایک دوست کی شادی میں دُوسرے شہر جانا تھا۔ ان کی بیگم باورچی خانے کی طرف مڑ گئیں۔ انھیں سب کے لیے ناشتا تیار کرنا تھا۔ جب کہ سب اپنے اپنے سکول اور کالج جانے کی تیاریوں میں مصروف تھے۔ اچانک ایک بار پھر سر ابدال دھاڑے:

"ارے! یہ کیا۔ بھئی"۔

"اب کیا ہوا؟" بیگم نے جھلا کر کہا۔

"سب کو بلاؤ۔ میں کہتا ہوں۔ سب کو بلاؤ"۔ انھوں نے چلا کر کہا۔

"یا اللہ رحم۔ ہو کیا گیا؟" بیگم ان کی طرف دوڑیں۔

"سنا نہیں۔ میں نے کیا کہا ہے۔ سب کو بلا لو"۔ انھوں نے آنکھیں نکالیں۔

"ارے۔ یہ کیا؟" بیگم بھی چونک اُٹھیں، پھر آواز لگائی:

"بچو۔ دوڑ کر ادھر آؤ۔ اپنے ابّو کے پاس۔ تمھارے ابو اس وقت آئینے کے سامنے موجود ہیں"۔

دوڑتے قدموں کی آوازیں سنائی دیں۔ چھے لڑکے اور پانچ لڑکیاں ان کے پاس جمع ہو گئے۔ ہما ان میں سب سے چھوٹی تھی۔ وُہ سب سے پہلے آئی تھی۔

"یہ۔ یہ کیا ابو۔ آپ نے اسے دھویا نہیں؟"

"خوب رگڑ رگڑ کر دھو چکا ہوں۔ یہ تو نہیں اُتر رہا"۔

"کیا مطلب؟" بیگم نے حیران ہو کر کہا۔

"میں تو اس کو بُری طرح کھرچ بھی چکا ہوں"۔ وُہ پریشان ہو کر بولے۔

"عجیب بات ہے۔ لگ۔ کہیں یہ کوئی بیماری تو نہیں ہے"۔

"آپ ڈاکٹر کو فون کریں"۔ بیگم نے مشورہ دیا۔

"لیکن میرا جہاز نکل جائے گا"۔

"میں ایرپورٹ فون کر کے آپ کا ٹکٹ کینسل کرا دیتی ہوں"۔ بیگم بولیں۔

"فون کے ذریعے ٹکٹ کینسل نہیں ہوتے۔ وہاں جانا پڑتا ہے۔ اُدھر خواجہ عباس راجا ایرپورٹ پر میری جان کو روئے گا"۔

"انھیں بھی میں فون کر دیتی ہوں۔ ان حالات میں آپ کس طرح جا سکیں گے۔ اتنا بڑا نیلا چاند گال پر لے کر"۔

"اچھا۔ یُونہی سہی۔ فون کر دو"۔ وہ تھکے تھکے سے کرسی پر بیٹھ گئے۔

ان کے بچے اُنگلی پھیر کر اس چاند کو دیکھنے لگے۔

"یہ جلد پر ابھرا ہوا تو ہرگز نہیں ہے"۔

تو نہیں چبھا تھا؟"

"کانٹا — نہیں تو — وہاں تو مجھے کوئی کانٹا نہیں چبھا۔ البتہ — اوہو" وہ اچھل پڑے — ان کی آنکھیں حیرت اور خوف سے پھیل گئیں۔

"البتہ کیا؟" ڈاکٹر نے بے چین ہو کر کہا۔

"البتہ — کل مجھے ایک لفافہ ملا تھا — ڈاکٹر کے ذریعے — اس پر صرف میرا پتا لکھا تھا — لفافہ بھیجنے والے نے اپنا پتا نہیں لکھا تھا — آپ کو معلوم ہے — اس لفافے میں کیا تھا؟"

"کیا تھا؟" ڈاکٹر نے حیران ہو کر کہا۔

"ایک کاغذ — کسی درخت کا کانٹا — بہت ہی نوکیلا — میں نے اس کی نوک پر ہاتھ پھیرا تو وہ تھوڑا سا چبھ گیا تھا۔"

"اوہ — اوہ" ڈاکٹر نے پریشان ہو کر کہا۔

"کیا ہوا ڈاکٹر صاحب — آپ بہت پریشان ہو گئے ہیں؟" سر ابدال نے بھی پریشان ہو کر کہا۔

"آپ کو فوراً افریقہ جانا ہو گا — وہاں کے ایک ڈاکٹر کا پتا میں لکھ کر دے رہا ہوں — آپ ان کے پاس آج ہی پہنچنے کی کوشش کریں — اگر آج کوئی پرواز نہیں جا رہی تو یہاں سے کسی بھی ملک چلے جائیں، جہاں سے آپ کو افریقہ

"ابو آپ اس پر پٹی کروا کر تو جا ہی سکتے ہیں۔" ہما نے مشورہ دیا۔

"لیکن بھئی — یہ کتنا برا لگے گا — اور پھر دعوت میں ہر کوئی پوچھے گا — کیا ہوا خان صاحب — کیا ہوا ابدال صاحب — میں کس کس کو کیا کیا بتاؤں گا — یہ ذرا تم بتا دو۔" انھوں نے جھلائے ہوئے انداز میں کہا۔

آخر ڈاکٹر وہاں پہنچ گیا — اس نے حیرت زدہ انداز میں اس نشان کا جائزہ لیا اور پانچ منٹ بعد بولا:

"میں نے اپنی زندگی میں ایسا کوئی کیس نہیں دیکھا — میں اپنے ایک دوست کو فون کرتا ہوں — ان کا تجربہ مجھ سے بہت زیادہ ہے۔" یہ کہ کر وہ فون کی طرف بڑھ گئے۔

ادھر ان کی پریشانی اور بڑھ گئی — دوسرا ڈاکٹر بھی آ گیا، وہ واقعی کوئی بہت تجربہ کار تھا — آتے ہی اس نے نشان کو غور سے دیکھا، پھر بولا:

"کیا آپ نے حال ہی میں افریقہ کے کسی جنگل کی سیر کی ہے؟"

"اوہ ہاں — کی تو ہے — تت تو کیا" وہ ہکلا کر رہ گئے۔

"تب یہ نشان اس سیر کا نتیجہ ہے — آپ کو کوئی کانٹا

کی پرواز مل سکے۔ ہوائی کمپنیاں یہ معلومات آپ کو خود
دے دیں گی۔ لیکن خیال رہے۔ آج ہی آپ ان سے ملیں
گے۔ آپ کے پاس۔ صرف چوبیس گھنٹے ہیں۔ میں ڈاکٹر
واک کو فون کر دیتا ہوں۔ وہ اپنے کلینک میں آپ کا
انتظار کریں گے۔ جلدی کریں"

"یا اللہ رحم۔ کیا یہ کوئی اس حد تک پریشان کن بات ہے؟"

"ہاں! اگر آپ چوبیس گھنٹے کے اندر اندر اس ڈاکٹر
سے علاج نہ کروا سکے تو آپ کی زندگی کی کوئی ضمانت نہیں دی
جا سکے گی"

"کیا!!" وہ چلائے۔ ان کا رنگ سفید پڑ گیا۔

"وقت نہ ضائع کریں"

وہ سب اسی وقت ہوائی کمپنی کے دفتر پہنچ گئے۔
ایک ذمے دار آدمی کو صورتِ حال بتائی گئی۔ اس نے خود
معلومات حاصل کرنے کے بعد انھیں ایک ملک کا ٹکٹ دلوایا۔
اور بتایا کہ وہاں بھی آپ کی سیٹ محفوظ کرا دی گئی ہے۔

چنانچہ وہ بڑے لڑکے اختر ابدال کے ساتھ روانہ ہو
گئے۔ دوسرے ملک پہنچنے میں انھیں صرف چار گھنٹے لگے۔
وہاں جہاز تیار تھا اور ان کے انتظار میں جہاز کو لیٹ کر دیا
گیا تھا۔ ایسا اس ذمے دار آفیسر کے ذریعے ہوا تھا۔ ورنہ

جہاز کب کا نکل گیا تھا۔ جہاز کے مسافروں کو بتا دیا گیا تھا
کہ ایک شخص کی زندگی اور موت کا سوال ہے۔ اس لیے سب
ذرا سی قدر انتظار کر لیں۔

آخر وہ اس جہاز پر سوار ہو گیا۔ سب کی نظریں ان
کی طرف اٹھ گئیں اور پھر واپس مڑ گئیں۔ مزید چار گھنٹے بعد
وہ اس ڈاکٹر کے کلینک میں موجود تھے۔ ڈاکٹر کو وہ نشان دیکھ
کر کوئی حیرت نہیں ہوئی تھی۔ اس نے صرف اتنا کہا تھا:

"یہاں تو ایسے مریض عام ہیں۔ وہ کانٹے کسی نہ کسی کو
چبھ ہی جاتے ہیں۔ اور ایسے لوگ فوراً میرے یا دوسرے
ڈاکٹروں کے پاس پہنچ جاتے ہیں۔ یہ کانٹا دراصل بہت
زہریلا ہے۔ کانٹا چبھنے کے دوسرے دن گال پر یہ نیلا
چاند ابھر آتا ہے۔ اور اگر زہر کا توڑ آدمی کو نہ دیا جائے تو
تیسرے دن آدمی مر جاتا ہے"

اس کے بعد انھوں نے ایک انجکشن انھیں لگایا۔ اور
انھیں لٹا دیا۔

"چار گھنٹے بعد آپ کا یہ نشان غائب ہو جائے گا۔ اس
کے بعد آپ یہاں سے چلے جائیے گا۔ میرا ملازم چار گھنٹے
تک آپ کے ساتھ یہاں ٹھہرے گا"

"اور آپ کی فیس"

"ڈاکٹر مسعود میرے دوست ہیں۔ یہ کیس انھوں نے بھیجا
ہے۔ لہٰذا میں فیس نہیں لوں گا۔ یوں بھی میں نے ایک
ٹیکہ ہی تو لگایا ہے"۔ انھوں نے مسکرا کر کہا۔

"پھر بھی ڈاکٹر صاحب۔ آپ فیس ضرور لے لیں"

"اچھا تو پھر آپ صرف دو ڈالر دے دیں"

"جی کیا فرمایا۔ صرف دو ڈالر۔ یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں
ڈاکٹر صاحب۔ یہ تو اس انجکشن کی قیمت ہو گی شاید"

"ہاں! میں نے انجکشن کی قیمت ہی وصول کی ہے۔ میں
فیس نہیں لیتا"

"کیا صرف مہمانوں سے یا مقامی لوگوں سے بھی؟"

"میں مقامی لوگوں سے بھی کوئی فیس نہیں لیتا۔ مریض
کو دیکھ کر نسخہ تجویز کرتا ہوں اور اس کے مطابق ادویات دے
دیتا ہوں۔ ان ادویات کی قیمت لے لیتا ہوں"

"لیکن اس طرح آپ کو کیا فائدہ ہوتا ہے؟"

"ادویات پر کمپنیاں جو کمیشن دیتی ہیں۔ میرے لیے
وہی کافی ہے۔ میں دولت نہیں سمیٹتا۔ ایک دن مرنا پڑے
گا، پھر حساب کتاب دینا ہو گا"

"اوہ۔ ہمارے ملک میں تو ڈاکٹر صرف معائنہ کرنے
کے دو سو روپے لے لیتے ہیں۔ کچھ ڈاکٹر سو روپے بھی

لیتے ہیں"

"یہاں بھی ایسے بے شمار ڈاکٹر ہیں، لیکن میں ایسا
نہیں کرتا"

"پھر تو آپ کے ہاں مریضوں کی قطاریں لگی رہتی ہوں گی؟"

"ہاں! یہ تو ہے۔ لیکن میں اپنے اوقات کے مطابق ہی
مریضوں کو دیکھتا ہوں۔ وقت ختم ہو جانے کے بعد نہیں دیکھتا۔
آپ کے لیے ضرور رکا ہوں آج"

"آپ کا احسان میں زندگی بھر یاد رکھوں گا"

"اس کی ضرورت نہیں۔ یہ میرا فرض تھا"۔ وہ مسکرائے۔

"آپ ایک دو انجکشن مجھے دے سکتے ہیں۔ ہمارے ملک
میں پھر کوئی ایسا کیس ہو سکتا ہے۔ ہو سکتا ہے، کوئی شرارتی
آدمی یہاں سے کچھ کانٹے ساتھ لے گیا ہو"

"ہاں ضرور۔ کیوں نہیں۔ لیکن یہ انجکشن صرف یہیں مل
سکتے ہیں۔ دنیا میں اور کہیں نہیں مل سکیں گے"۔ یہ کہتے وقت
وہ مسکرائے۔

"جی کیا مطلب؟"

"یہ انجکشن میں نے خود بنائے ہیں"

"اوہو اچھا"

"جی ہاں! تجربات کرنے پڑے ہیں مجھے بہت

مدّت تک — تب کہیں جا کر میں اس زہر کا توڑ دریافت کرنے میں کامیاب ہو سکا۔"

"آپ کا بہت بہت شکریہ — آپ مجھے ایک دو نہیں، پورے دس انجکشن دے دیں۔"

دس انجکشن خرید کر وہ اپنے وطن لوٹ آئے — گھر والوں نے جو انھیں بالکل درست حالت میں دیکھا تو بہت خوش ہوئے، لیکن پھر اچانک وہ سب فکر مند ہو گئے — کیونکہ سر ابدال نے بات ہی ایسی کہی تھی — انھوں نے دوسرے دن ناشتے پر کہا:

"آخر وہ کون ہے — جو مجھے جان سے مار ڈالنا چاہتا ہے؟"

"اوہ!" وہ دھک سے رہ گئے۔

"اس طرف تو ہم نے توجہ ہی نہیں دی تھی۔" بیگم ابدال بولیں۔

"وہ کسی اور طرح بھی وار کر سکتا ہے۔" اختر ابدال نے کہا۔

اس وقت ہما کی نظر اخبار کی ایک خبر پر پڑی:

"اُف مالک — ابّو یہ خبر پڑھیے۔" اس نے چیخ کر کہا۔

سب بُری طرح گھبرا گئے، کیونکہ ہما کچھ ایسے ہی خوف زدہ انداز میں چلائی تھی — اور پھر سب کے سب اس خبر کی طرف متوجہ ہو گئے — خبر یہ تھی:

"افریقہ کے مشہور و معروف ڈاکٹر کو قتل کر دیا گیا۔

نمائندہ خصوصی: گزشتہ رات ملک کے معروف ترین ڈاکٹر ڈاکٹر واک کو کسی نے ان کی رہائش گاہ پر قتل کر دیا۔ وہ اپنے کمرے میں خون میں لت پت ملے — ان کا جسم اکڑ کر بالکل سخت ہو چکا تھا — خیال کیا جاتا ہے کہ رات کے ابتدائی حصے میں یہ واردات کی گئی — موسم سرما کی وجہ سے لاش بُری طرح اکڑی ہوئی ملی۔"

غائب ہیں

"یہ کیا بات ہوئی:" سر ابدال نے کھوئے کھوئے لہجے میں کہا۔

"جو شخص آپ کو ہلاک کرنا چاہتا تھا۔ اس نے ڈاکٹر واک کو قتل کر دیا، کیونکہ اس نے آپ کو انجکشن لگا کر اس کانٹے کے زہر سے نجات حاصل کرنے میں مدد دی تھی۔" بیگم ابدال بولیں۔

"ہاں! لیکن وہ نہیں جانتا۔ میں ڈاکٹر واک سے دس انجکشن لے آیا ہوں۔"

"اوہ! یہ آپ نے بہت اچھا کیا ابو۔" ہما نے خوش ہو کر کہا۔

"لیکن ابو! اس معاملے کی تحقیقات تو ہونی ہی چاہیے۔ آخر وہ کون ہے جو آپ کو قتل کرنا چاہتا ہے۔ اور کیا اب جب کہ اس نے ڈاکٹر واک کو ہلاک کر دیا ہے۔ کیا وہ آپ پر پھر وار کرے گا؟"

"ایک بار پھر فکر اور پریشانی نے ہمیں گھیر لیا ہے۔ ہمیں کچھ نہ کچھ کرنا ہوگا۔ ٹھہرو۔"

یہ کہہ کر سر ابدال نے کسی کے نمبر ملائے۔ دوسری طرف کی آواز سن کر انھوں نے کہا:

"ہیلو خان صاحب۔ سر ابدال خان بول رہا ہوں۔ میں بہت پریشان ہوں۔ کیا آپ میری مدد کے لیے آ سکتے ہیں؟"

دوسری طرف کا جواب سن کر انھوں نے ریسیور رکھ دیا۔ اور پھر بیس منٹ بعد ان کے دروازے کی گھنٹی بجی:

"آپ نے کسے بلایا ہے ابا جان۔ آنے والا کوئی غلط آدمی بھی ہو سکتا ہے۔"

"میں نے اپنے ایک دوست کو بلایا ہے اور میں اس کی آواز بہت اچھی طرح پہچانتا ہوں۔ ٹھہرو۔ میں خود دروازہ کھولوں گا۔" یہ کہہ کر سر ابدال خان دروازے کی طرف لپکے۔

"کون؟" وہ بولے۔

"بھئی یہ میں ہوں۔ جسے تم نے فون کیا تھا۔"

"ہوں۔ اچھا۔" انھوں نے کہا اور پھر دروازہ کھول دیا۔

"خیر تو ہے۔ بہت خوف زدہ ہو۔" دوست نے کہا۔

"آؤ آؤ۔ ابھی ساری کہانی سناتا ہوں۔"

ساری کہانی سن کر دوست نے کہا:

"میں سمجھ گیا۔ تم نے اس مقصد کے لیے خاص طور پر مجھے
ہی کیوں بلایا ہے۔" انھوں نے کہا اور فون پر نمبر ڈائل کرنے
لگے۔ جلد ہی دوسری طرف سے کسی نے کہا:
"السلام علیکم۔ فرمائیے آپ کو کس سے ملنا ہے؟"
"محمود! یہ میں ہوں۔" خان صاحب نے کہا۔
"ارے انکل خان رحمان۔ آپ۔ بھئی واہ مزا آگیا۔"
"مزا کیسے آگیا بھلا۔ اتنی سی بات میں مزے کی گنجائش
کہاں۔" وہ بولے۔
"مزے کی گنجائش اس طرح ہے کہ ہم اس وقت آپ
کو فون کرنے پر ہی غور کر رہے تھے۔" محمود بولا۔
"لیکن خالی غور کرنے سے کیا ہوتا ہے۔" خان رحمان بولے۔
"لیکن غور کرنے کے بعد ہم فون بھی کرتے۔"
"اور میں تمھیں نہ ملتا، کیونکہ میں اس وقت گھر سے نہیں
بول رہا۔"
"کوئی بات نہیں، ہم آپ کو تلاش کر لیتے۔"
"اچھا خیر۔ جمشید کو فون دو۔"
"سوری انکل۔ وہ گھر نہیں ہیں۔"
"اوہو۔ تب پھر تم آ جاؤ۔"
"لیکن کہاں آ جائیں؟"

"سر ابدال خان کے ہاں۔ پتا تو جانتے ہی ہو گے۔ اگر
نہیں تو شہر کے شمالی حصے پر آ جاؤ۔"
"نام بھی سن رکھا ہے۔ اور پتا بھی جانتے ہیں۔ ویسے انکل
خیر تو ہے؟"
"بس یوں سمجھ لو۔ ایک کیس مل گیا تمھیں۔"
"وہ تو ہم اس وقت سمجھ گئے تھے جب فون کی گھنٹی بجی تھی۔"
"لیکن بھئی۔ فون کی گھنٹی تو روزانہ نہ جانے کتنی مرتبہ سنائی دیتی
ہو گی۔ تو کیا تم ہر بار یہی سمجھ لیتے ہو؟"
"جی نہیں انکل۔ کسی کسی گھنٹی پر ہی ہمیں یہ محسوس ہوتا ہے کہ
کیس ملنے والا ہے۔"
"اچھا بھائی۔ تم آ جاؤ بس۔" انھوں نے تنگ آکر ریسیور
رکھ دیا اور سر ابدال کی طرف مڑے:
"انسپکٹر جمشید تو گھر نہیں ہیں، البتہ محمود، فاروق اور فرزانہ
آ رہے ہیں؛ تاہم جونہی وہ گھر آئیں گے۔ انھیں میرا پیغام
مل جائے گا اور وہ یہاں آ جائیں گے۔"
"بہت خوب۔" سر ابدال نے مطمئن ہو کر کہا۔
آدھ گھنٹے بعد دروازے کی گھنٹی بجی۔ خان رحمان فوراً بولے:
"لیجیے۔ وہ آ گئے۔"
"آپ کیسے کہہ سکتے ہیں۔ یہ وہی ہیں۔ کوئی اور بھی

تو ہو سکتا ہے،" سرابدال نے کہا۔

"میں ان کے گھنٹی بجانے کے انداز سے بخوبی واقف ہوں،"
خان رحمان بولے۔

"اوہ — اچھا،" سرابدال نے کہا۔

"خیر — میں خود دروازہ کھولتا ہوں — آپ بالکل فکر نہ
کریں،" انھوں نے کہا۔

خان رحمان نے دروازہ کھولا تو محمود، فاروق اور فرزانہ
ایک ساتھ بولے:

"السلامُ علیکم انکل۔"

"وعلیکم السلام! اس کا مطلب ہے — جب تم گھر سے چلے،
جمشید ابھی نہیں آئے تھے؟"

"اگر آ گئے ہوتے تو اس وقت وہ ہمارے ساتھ ہوتے
انکل،" محمود نے کہا۔

"ہوں خیر — پیغام تو تم چھوڑ ہی آئے ہو گے؟" خان
رحمان بولے۔

"بالکل! یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات ہے،" فرزانہ نے جلدی
جلدی کہا۔

"اچھا تو میں اپنا یہ سوال واپس لے لیتا ہوں،" انھوں
نے کہا۔

"لے لیجیے — ہم کیا کریں گے رکھ کر،" فاروق نے
مسکراتے ہوئے کہا۔

وہ انھیں اندر لے آئے۔

اب سرابدال خان نے انھیں اپنی کہانی سنائی، پھر ڈاکٹر
واک کے قتل کی خبر سنائی — محمود، فاروق اور فرزانہ یہ ساری
کہانی سن کر دھک سے رہ گئے۔

"وہ دس انجکشن کہاں ہیں — جو آپ ڈاکٹر واک سے خرید
لائے تھے؟"

"میرے بریف کیس میں۔"

"ہم ان کو دیکھنا چاہتے ہیں،" محمود نے بے تابانہ انداز
میں کہا۔

"میں ابھی لے کر آتا ہوں،" یہ کہہ کر سرابدال خان کمرے
سے نکل گئے۔

"کیا خیال ہے — کیس کافی پُراسرار سا ہے؟"

"کافی نہیں — بہت زیادہ،" فرزانہ بڑبڑائی۔

"اس کا مطلب ہے — جمشید کو بلانا ہی ہو گا،" خان رحمان
نے کہا۔

"وہ بھی آ جائیں گے — فکر نہ کریں،" محمود بولا۔

اس وقت قدموں کی آواز سنائی دی — اور پھر سرابدال

کمرے میں داخل ہوئے، لیکن یہ دیکھ کر وہ دھک سے رہ
گئے کہ ان کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔ جسم پر
لرزہ سا تھا اور آنکھوں سے بے پناہ خوف جھانک رہا تھا۔
پھر انھوں نے کانپتی آواز میں کہا:
"وہ۔ وہ دس انجکشن غائب ہیں۔"

ایرہوسٹس

وہ دھک سے رہ گئے۔ آنکھوں میں الجھن تیر گئی۔ آخر
محمود نے کہا:
"اس کا مطلب سمجھتے ہیں آپ؟"
"کک۔ کس کا؟" سر ابدال خان نے گھبرا کر کہا۔
"ڈاکٹر واک کے قتل کا اور دس انجکشنوں کے غائب ہونے
کا۔" محمود بولا۔
"ن۔ نہیں۔"
"اس کا صرف اور صرف یہ مطلب ہے کہ اب اگر کسی
کے چہرے پر وہ نیلا چاند نظر آئے تو وہ ڈاکٹر واک سے
علاج نہ کرا سکے اور نہ ان سے انجکشن لگا سکے۔ بلکہ یہاں بھی
اس سے دس آدمی فائدہ نہ اٹھا سکیں۔"
"دس آدمی۔ کون سے دس آدمی؟" سر ابدال خان نے حیران
ہو کر پوچھا۔

"آپ دس انجکشن لائے تھے ۔ اس شہر کے اگر دس آدمیوں کے چہروں پر بھی وہ نیلا چاند نظر آتا تو انھیں ان دس انجکشنوں سے بچایا جا سکتا تھا ۔ لیکن اب اس کا بھی امکان نہیں رہا۔"

"تو کیا آپ لوگوں کا مطلب یہ ہے کہ وہ میرے علاوہ اور لوگوں کو بھی اس مرض میں مبتلا کرے گا۔"

"امکان تو یہی ہے ۔ یا پھر وہ کم از کم آپ پر ضرور وار کرے گا اور وار اس کانٹے کے ذریعے ہی کرے گا۔ پہلے اس نے لفافے کے ذریعے کانٹا بھیجا تھا ۔ اس وقت آپ کانٹے سے واقف بھی نہیں تھے ۔ اب جب کہ آپ کو کانٹے کی خاصیت کا علم ہو چکا ہے ۔ تو وہ کسی اور ذریعے سے آپ تک کانٹا پہنچائے گا ۔ اس طرح تو آپ شاید سوچ بھی نہ سکیں ۔ اس سے ہم صرف ایک نتیجے پر پہنچے ہیں۔" محمود یہاں تک کہہ کر رک گیا۔

"اور وہ کیا؟" وہ جلدی سے بولے۔

"یہ کہ وہ ہر قیمت پر آپ کو قتل کر دینا چاہتا ہے ۔ آخر وہ کون ہے خان صاحب؟"

"اگر مجھے معلوم ہو جائے ۔ تو کچا نہ چبا جاؤں اسے۔" انھوں نے تلملا کر کہا۔

"کیا آپ بعد میں چاہیے گا ۔ پہلے ہمیں اس سے پوچھ لینے دیجیے گا کہ وہ آخر ایسا کیوں چاہتا ہے۔"

"اگر اس سے پوچھنے کا موقع ملا تو ضرور پوچھ لیجیے گا ۔ میں اعتراض نہیں کروں گا ، لیکن جونہی مجھے معلوم ہوا کہ یہ ہے وہ شخص جو مجھے اس زہریلے کانٹے کے ذریعے ہلاک کرنا چاہتا ہے ۔ میں اسے گولی مار دوں گا۔"

"لیکن اس طرح آپ قانون کو اپنے ہاتھوں میں لیں گے۔"

فاروقی نے منہ بنایا۔

"دیکھیے جناب ! ایک شخص مجھے قتل کرنا چاہتا ہے ۔ میں اپنے آپ کو بچانے کے لیے اسے قتل کر سکتا ہوں۔"

"ہاں ! لیکن اس وقت ۔ جب کہ یہ بات صاف ثابت ہو جائے۔"

"اگر اس کے پاس سے کانٹا برآمد ہو جائے تو کیا یہ بات صاف ثابت نہیں ہو جائے گی۔"

"اس سے زیادہ صاف اور کس طرح ثابت ہو سکتی ہے۔"

خان رحمان مسکرائے۔

"ہاں ٹھیک ہے ۔ اس صورت میں ضرور آپ کو بے گناہ خیال کیا جائے گا۔" انھوں نے کہا۔

"شکریہ ! دیکھنا یہ ہے کہ وہ ہے کون۔" سرابدال بولے۔

"آپ کے ساتھ افریقہ کے سفر پر کون کون حضرات گئے تھے؟" محمود بولا۔

"ہم دس آدمی گئے تھے، لیکن وہ نو کے نو بہترین آدمی ہیں، میرے بہت پرانے دوست ہیں۔ ان میں سے تو ہرگز کوئی ایسا آدمی نہیں ہو سکتا۔"

"یہ آپ کا کہنا ہے۔ ہمارا نہیں۔" محمود مسکرایا۔

"کیا مطلب۔ کیا آپ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ ...." وہ بوکھلائے ہوئے انداز میں کہتے کہتے رک گئے۔

"اگر اس سفر میں آپ کے ساتھ صرف نو آدمی تھے اور دسواں آدمی کوئی نہیں تھا تو پھر ان نو میں سے ہی کوئی ایسا آدمی ہے۔ جو آپ کی زندگی نہیں چاہتا۔"

"یہ غلط ہے۔ اس لیے کہ ہم دس کے دس انتہائی نزدیکی دوست ہیں اور ہم ایک دوسرے کے لیے جان تک دے سکتے ہیں۔"

"بہت خوب! تب تو اس معاملے کی تہ تک پہنچنا ہوگا، آپ افریقہ کس سلسلے میں گئے تھے؟"

"صرف سیر کرنے۔" انھوں نے کہا۔

"وہاں آپ لوگوں کے ساتھ کوئی عجیب واقعہ تو پیش نہیں آیا؟"

"عجیب واقعہ۔ ن ن۔ نہیں تو۔" انھوں نے فوراً کہا۔

محمود، فاروق اور فرزانہ حیران ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ اس سوال کے جواب میں انھوں نے جس طرح یہ کہا تھا کہ ن ن۔ نہیں تو۔ اس سے صاف نظر آ رہا تھا کہ وہاں کوئی عجیب واقعہ ضرور ہوا ہے۔ تب پھر اس کا مطلب یہ تھا کہ سر ابدال کچھ چھپا رہے تھے۔ خیر انھوں نے اس سوال کو گول کر دیا اور محمود بولا:

"ٹھیک ہے۔ مہربانی فرما کر اپنے ان نو دوستوں کے نام اور پتے لکھ دیں۔"

"لیکن انھیں پریشان کرنے کی ضرورت کیا ہے۔ ان کا اس نیلے چاند والے معاملے سے کوئی تعلق نہیں ہے۔"

"تب پھر ہمیں بلانے کی کیا ضرورت تھی سر؟" فاروق نے جل کر کہا۔

"آپ لوگ اس شخص کو پکڑنے کی کوشش کریں جو مجھے قتل کرنا چاہتا ہے۔"

"اس شخص کو پکڑنے کی صرف اور صرف ایک صورت ہے اور وہ یہ کہ آپ اپنے نو دوستوں کے نام پتے بتا دیں یا پھر یہ اقرار کریں کہ اس سفر میں اور کوئی بھی آپ کے ساتھ تھا۔" انھوں نے چونک کر کہا۔

"تو پھر بتائیے نا — وہ کون تھا — کیا آپ کے ساتھ
یہیں سے گیا تھا؟"
"نہیں — دورانِ سفر ساتھ ہوا تھا — بہت باتونی — لیکن
افریقہ کے جنگلوں سے بہت اچھی طرح واقف تھا اور ہم نے
بھی اسے اسی وجہ سے ساتھ لے لیا تھا کہ چلو — واقفیت ہی
حاصل ہو گی۔"
"تو پھر — کیا اس کے ساتھ کوئی عجیب واقعہ ہوا تھا؟"
"نہیں — لیکن یہ وہی تھا — جس نے ہمیں ان کانٹوں
کے بارے میں بتایا تھا — ہم ان خاردار جھاڑیوں کی
طرف بڑھ رہے تھے کہ اس نے روک لیا اور بتایا کہ ہم
ایک خوفناک موت کی طرف بڑھ رہے تھے، پھر اس نے
ان کانٹوں کے بارے میں تفصیل سے بتایا۔"
"تو کیا آپ لوگوں نے وہ کانٹے توڑے تھے؟"
"توبہ کریں۔"
"توبہ کرتا ہوں۔" فاروق نے فوراً کہا۔
"ابھی ان کی بات پوری نہیں ہوئی۔" فرزانہ نے جھلا کر کہا۔
"تو اس میں انگارے چبانے کی کیا ضرورت ہے —
بات بھی پوری ہو جائے گی۔" فاروق نے بُرا سا منہ بنایا۔
"لڑنے کی ناکام کوشش نہ کرو — اگر کرنی ہے تو کامیاب

کوشش کرو۔" فرزانہ نے بھنا کر کہا۔
"میں کہہ رہا تھا — ہم بھلا کانٹوں کے نزدیک کیوں جاتے،
اس نے بتایا تھا کہ صرف نوک اگر جلد کو چھو جائے، تب
بھی تین دن بعد موت واقع ہو جاتی ہے۔"
"تب پھر جب آپ کو لفافے میں کانٹا نظر آیا تو آپ
نے اس کی نوک کو کیوں چھوا؟"
"بے خیالی میں — اس وقت افریقہ کے کانٹوں کا خیال
ذہن سے نکل گیا تھا — اس پُر اسرار آدمی نے ہمیں صرف
یہ بتایا تھا کہ کانٹے حد درجے زہریلے ہیں — اگر کوئی ان کی
نوک صرف چھو لے تو بھی تین دن کے اندر مر جاتا ہے اور
اگر کانٹا چبھ جائے تو موت فوری واقع ہو جاتی ہے — یہی
وجہ ہے کہ نیلے چاند کو دیکھ کر مجھے اس پُر اسرار آدمی
کا اور افریقہ کے جنگل کا خیال تک نہیں آیا، اگر کبھی وہ
نیلے چاند کا ذکر بھی کر دیتا تو میں اسی وقت سمجھ جاتا۔"
"خیر کوئی بات نہیں — ہم تو صرف ایک بات کہیں گے۔
ارے ہاں — پہلے یہ بتا دیں — اس پُر اسرار آدمی سے بھی
ملاقات ہو سکتی ہے یا نہیں؟"
"وہ ہمارے ملک کا نہیں تھا۔"
"کوئی بات نہیں — آپ کو اگر پتا معلوم ہے تو بتا دیں۔"

نکل گئے۔"

"لیکن اس بے چارے کا بھی اس معاملے سے کوئی تعلق نہیں ہو سکتا۔"

"یہ دیکھنا ہمارا کام ہے جناب۔" فاروق جل گیا۔

"اچھی بات ہے۔ اس پُراسرار آدمی کا نام تھا۔ روگان۔ شربی لینڈ کا رہنے والا تھا۔ اور اس کا پتا میں نوٹ بک سے دیکھ کر بتا سکتا ہوں۔"

"تو پھر وہ بھی بتا ہی دیں۔"

پتا نوٹ کرکے وہ اٹھ کھڑے ہوئے۔ انھوں نے خان رحمان کی طرف دیکھا:

"آپ کا کیا پروگرام ہے انکل۔ ہمارا تو اب یہاں کوئی کام نہیں رہا۔ بلکہ ہمیں تو بلانے کی ضرورت ہی نہیں تھی، خان صاحب تو اس کیس کی تفتیش کرانا ہی نہیں چاہتے۔"

"وہ اس لیے کہ ان کے دوستوں کو پریشانی نہ ہو۔" خان رحمان جلدی سے بولے۔

"لیکن ان کی جان کا دشمن ان نو میں سے ایک بھی ہو سکتا ہے۔ اس صورت میں یہ خود پر ظلم کریں گے۔" محمود نے منہ بنایا۔

"اب میں کیا کہہ سکتا ہوں۔ یہ ان کی مرضی ہے۔" خان

رحمان نے کندھے اچکائے۔

"ایک اور بات۔ افریقہ کی سیر کے دوران کوئی نہ کوئی عجیب واقعہ انھیں ضرور پیش آیا تھا۔ وہ واقعہ بتانا بھی خان صاحب کو پسند نہیں۔ میں غلط تو نہیں کہہ رہا جناب۔"

"بالکل غلط۔ ہمیں کوئی واقعہ پیش نہیں آیا۔" انھوں نے بھنا کر کہا۔

"آپ کی مرضی۔ ہم جا رہے ہیں۔ ہماری مدد کی ضرورت محسوس کریں تو آواز دے دیجیے گا۔" محمود نے کہا اور باہر کی طرف چل پڑا۔ فاروق اور فرزانہ نے اس کا ساتھ دیا۔ البتہ خان رحمان وہیں رک گئے۔ انھوں نے آنکھوں سے اشارہ کیا کہ تم جاؤ۔ میں کچھ دیر بعد آؤں گا۔

وہ گھر پہنچے ہی تھے کہ خان رحمان کا فون موصول ہوا:

"بھئی میں اس لیے رک گیا تھا کہ شاید وہ تم لوگوں کی غیر حاضری میں یہ بات بتا دیں کہ افریقہ کے جنگل میں کیا واقعہ پیش آیا تھا، لیکن وہ حضرت ٹس سے مس تک نہیں ہوئے۔"

"ہوں! یعنی انھوں نے وہ واقعہ نہیں بتایا۔"

"ہاں! یہی کہتے رہے کہ کوئی واقعہ سرے سے پیش ہی نہیں آیا۔"

"آپ ان کے نو دوستوں میں سے کسی کو جانتے ہیں؟"

"ان کے تو پتا نہیں کتنے دوست ہیں، اب کیا معلوم
کہ کون سے خود دوستوں کو لے کر گئے تھے۔"

"خیر! ہم دونوں ان سے مل لیتے ہیں۔"

"یہ ٹھیک رہے گا۔" خان رحمان نے خوش ہو کر کہا۔

"گویا آپ بھی ہمارے ساتھ جا رہے ہیں۔"

"ہمیں اس بہانے مشرقی لینڈ کی سیر ہی ہو جائے گی،
سنا ہے۔ بہت مزے کی جگہ ہے۔"

"لیکن ابا جان کا کیا کریں۔" محمود نے کہا۔

"کیوں! کیا وہ نہیں جا رہے ہیں؟"

"ابھی ان سے بات ہی کہاں ہوئی ہے۔" محمود نے کہا۔

"تو بات کر لو بھئی۔"

"ابھی وہ گھر لوٹے ہی کب ہیں۔"

"تو انہیں لوٹنے دو بھئی۔" انھوں نے جھلا کر کہا۔

"نہیں انکل۔" محمود نے فوراً کہا۔

"لیکن میرا نام نہیں انکل نہیں ہے۔"

"آپ یہیں آ جائیں انکل۔ مل کر ان سے بات کریں گے،
کہیں ان کا موڈ آف ہو گیا تو بات بگڑ جائے گی۔"

"اوہ تو یہ بات ہے۔ خیر۔ میں آ رہا ہوں۔"

"ایک منٹ انکل۔ کیا پروفیسر انکل کو ساتھ نہیں لیں گے۔"

"اگر انھوں نے پسند کیا۔ میں انھیں بھی فون کرتا ہوں۔
تم فکر نہ کرو۔"

"اگر آپ کہتے ہیں تو نہیں کریں گے۔" محمود نے خوش ہو کر کہا۔

جلد ہی دونوں ان کے گھر پہنچ گئے۔ آتے ہی پروفیسر
داؤد بولے:

"اگرچہ اس کیس میں میرا کوئی بھی دخل نظر نہیں آ رہا، لیکن
تم لوگوں کا ساتھ دینے کے لیے میں پھر بھی چلا آیا ہوں۔"

"یہی تو آپ کی خوبی ہے انکل۔"

اسی وقت دروازے کی گھنٹی بجی۔ وہ اچھل پڑے۔ انداز
انسپکٹر جمشید کا تھا۔ جونہی وہ السلام علیکم کہہ کر اندر داخل ہوتے
چلا اٹھے:

"ہائیں۔ آپ حضرات بھی یہیں ہیں۔ تب تو مجھے کسی
سازش کی بو کو سونگھ ہی لینا چاہیے۔"

"ہمارے گھر میں سونگھنے پر کوئی پابندی نہیں ہے ابا جان۔"
فاروق نے خوش ہو کر کہا۔

"چلو مان لیا۔ اب بات بتاؤ۔"

محمود نے جلدی جلدی بات بتائی۔ خان رحمان نے اس
کی تائید کی اور پروفیسر داؤد نے یہ کہہ کر جان چھڑائی:

"اور مجھے خان رحمان ساتھ لے آئے ہیں۔"

"یہ سمجھ گیا" انسپکٹر جمشید مسکرائے۔

"جی۔ آپ کیا سمجھ گئے؟"

"یہ کہ آپ لوگوں کا پروگرام مشرقی لینڈ جانے کا ہے"

"یہ تو تم میں کمال ہے جمشید۔ اڑتی چڑیا کے پر گن لیتے ہو"

"لیکن اڑتی چڑیا پر نشانہ نہیں لگاتا" انسپکٹر جمشید مسکرائے۔

"جی۔ کیا مطلب۔ یہاں اس جملے کی کیا ضرورت تھی؟"

"مطلب یہ کہ جب تک یقین نہ ہو جائے۔ وار نہیں کرتا"

"آپ کیا کہنا چاہتے ہیں؟"

"یہ کہ۔ وہاں جانے کی کیا ضرورت ہے۔ جب گھر بیٹھے اس سے بات ہو سکتی ہے"

"گھر بیٹھے بات ہو سکتی ہے۔ کیسے؟"

"میرا وہاں ایک دوست ہے۔ وہ میرا فون ملتے ہی حرکت میں آ جائے گا اور روگان کو تلاش کر کے میری فون پر بات کرا دے گا۔ اس کام میں صرف چند سو روپے خرچ ہوں گے۔ جب کہ دوسرے پروگرام پر کئی ہزار روپے خرچ آئیں گے"

"لیکن جمشید! یہ بھی تو سوچو۔ اس طرح سیر بھی تو ہو جائے گی" خان رحمان جلدی سے بولے۔

"اگر بات سیر کی ہوتی تو چلے جاتے۔ لیکن اگر صرف اس

غرض سے جانا ہے کہ روگان سے ملاقات ہو جائے گی تو اس کی ضرورت نہیں"

"ٹھیک ہے جمشید۔ ہم سیر کے لیے چلے جاتے ہیں۔ لگے ہاتھوں اس سے بات کرتے آئیں گے"

"ٹھیک ہے۔ چلے چلتے ہیں، لیکن میرا ایک اندازہ ہے"

"اور وہ اندازہ کیا ہے؟"

"میں بتاؤں گا نہیں۔ لکھ کر رکھ لیتا ہوں، کیونکہ بتانے کا بھی کوئی فائدہ نہیں ہو گا۔ اب آپ لوگ رکنے والے نہیں"

"شکریہ جمشید۔ تم میں یہی خوبی ہے۔ دوستوں کا ساتھ دیتے ہو۔ چاہے تمہارا پروگرام ہو یا نہ ہو"

انسپکٹر جمشید مسکرا دیے اور ایک کاغذ پر الگ ہٹ کر کچھ لکھا، پھر کاغذ خفیہ جیب میں رکھ لیا۔ دوسرے دن وہ مشرقی لینڈ کے لیے روانہ ہو گئے۔

"ہمیں۔ تمہارے ایک عدد پُر لطف سفر ہاتھ لگ گیا" فاروق نے خوشی سے بھرپور لہجے میں کہا۔

"تم تو اس طرح کہہ رہے ہو جیسے کوئی خزانہ ہاتھ لگ گیا ہو" فرزانہ نے برا سا منہ بنایا۔

"یہ بھی خزانہ ہی ہے، لیکن سفر کا خزانہ" محمود مسکرایا۔

"کیا کہا۔ سفر کا خزانہ۔ یہ تو کسی ناول کا نام ہو سکتا ہے"

فاروق نے خوش ہو کر کہا۔

"اب رکھ بھی لو کسی ناول کا نام۔" محمود نے جل کر کہا۔

"مہربانی فرما کر جہاز میں لڑیے جھگڑیے نہیں۔" پاس سے گزرتی ہوئی ایر ہوسٹس نے مسکرا کر کہا۔

"آپ نے یہ کیسے جان لیا کہ ہم لڑ رہے ہیں؟" محمود کے لہجے میں حیرت تھی۔

"آپ کے بارے میں سُنا ہے کہ آپ کہیں بھی لڑے جھگڑے بغیر نہیں رہتے۔"

"اوہ! تو آپ ہمیں جانتی ہیں؟"

"اتفاق ہے، بلکہ میں تو یہ بھی جانتی ہوں کہ آپ شرلی لی
کس لیے جا رہے ہیں۔"

"کیا مطلب؟" اس بار انسپکٹر جمشید ان سے پہلے بول اُٹھے۔ ان کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں — ایر ہوسٹس جواب دیے بغیر آگے بڑھ چکی تھی۔

دروازہ

"یہ کیا بات ہوئی ابا جان — آخر اس ایر ہوسٹس کو کس طرح معلوم ہے کہ ہم کہاں اور کیوں جا رہے ہیں۔"

"کہاں کا جواب تو خیر یہ ہے کہ اسے معلوم ہے — اس جہاز کی منزل کون سی ہے — جہاز سیدھا شرلی لینڈ جا رہا ہے — اس کو درمیان میں کہیں اور نہیں رکنا — نہ شرلی لینڈ رک کر کہیں آگے جائے گا — بلکہ واپس ہمارے ملک ہی لوٹے گا — رہ گئی بات دوسری — وہ حیران کن ترین ہے، ہم نے اپنے پروگرام کے متعلق کسی کو نہیں بتایا — گھر بیٹھ کر پروگرام بنایا تھا — ان حالات میں اس ایر ہوسٹس کا یہ کہنا — یہ جانتی ہے، ہم کہاں جا رہے ہیں — پُراسرار بات ہے۔"

"اور پھر ان محترمہ نے جواب بھی تو نہیں دیا۔"

"اسے اپنی ڈیوٹی بھی تو ادا کرنا ہے — اس وقت یہ سب کو کھانے پینے کی چیزیں پہنچا رہی ہے — ذرا فارغ ہو لے

تو بات کریں گے۔" انسپکٹر جمشید نے کہا۔

وہ اس کے فارغ ہونے کا انتظار کرتے رہے۔ آخر وہ فارغ ہو گئی۔ انسپکٹر جمشید نے اسے بلانے کے لیے گھنٹی کا بٹن دبا دیا۔ فوراً ہی وہ آ موجود ہوئی۔ اس کے چہرے پر ایک پُر اسرار مسکراہٹ تھی:

"میں جانتی ہوں۔ آپ نے مجھے کیوں بلایا ہے۔ یہ جاننے کے لیے کہ میں یہ بات کس طرح جانتی ہوں کہ آپ شہربی لینڈ کیا کرنے جا رہے ہیں۔"

"ہاں! یہ بات درست ہے۔ کیا آپ بتانا پسند کریں گی۔" انھوں نے کہا۔

"نہیں۔ میں اپنی معلومات دوسروں کو نہیں دیا کرتی۔ یہ میرا راز ہے اور میں آپ کو بتانے کی پابند نہیں ہوں۔"

"یہ جہاز ہمارے مُلک کا ہے۔ آپ ہمارے مُلک کی مُلازم ہیں۔ یہ بات ٹھیک ہے یا غلط؟"

"اس میں کوئی شک نہیں۔"

"تب پھر آپ بتانے کی پابند ہیں۔ اگر آپ بات نہیں بتائیں گی تو آپ کو گرفتار کیا جا سکتا ہے۔" انسپکٹر جمشید کا لہجہ خشک تھا۔

"کیا کہا آپ نے۔ مجھے گرفتار کیا جا سکتا ہے۔" اس کے

لہجے میں طنز تھا۔

"تو کیا آپ کے خیال میں میں آپ کو گرفتار نہیں کرا سکتا۔"

"جی نہیں۔ بالکل نہیں۔ میں اس ملک کی ایک آزاد شہری ہوں۔ اگر میرے پاس کوئی اطلاع ہے، جس کو میں نے اپنی کوشش سے حاصل کیا ہے تو اس پر میرا حق ہے۔ میں کسی کو اس بارے میں کچھ بتاؤں یا نہ بتاؤں، ہمارے مُلک کا قانون مجھے بتانے پر مجبور نہیں کر سکتا۔"

"اگر یہ اطلاع ذاتی قسم کی ہو، تب تو آپ کی بات ٹھیک ہے، لیکن اگر معاملہ ملک سے متعلق ہو تو پھر آپ کی بات نہیں چلے گی۔"

"یہ کیا بات ہوئی۔"

"یہ سفر ہمارا ذاتی نوعیت کا نہیں ہے۔ ایک کیس کے سلسلے میں کیا جا رہا ہے۔ جیسا کہ آپ کا دعویٰ ہے۔ آپ جانتی ہی ہیں۔ ان حالات میں ہم آپ کو بتانے پر مجبور کر سکتے ہیں۔"

"ضرور کر کے دیکھ لیں۔ میں پھر بھی نہیں بتاؤں گی۔" اس نے اکڑ کر کہا۔

"محترمہ! میں تو آپ کو ایک بہت معقول خاتون سمجھا تھا، لیکن آپ کافی حد تک نامعقولیت کا ثبوت دے رہی

ہیں۔ اب میں آپ پر واضح کر رہا ہوں۔ تاکہ آپ بعد
میں یہ نہ کہیں کہ میں نے آپ کو خبردار نہیں کیا تھا۔
یہ معاملہ بہت سنگین ہے۔ ایک بہت اہم آدمی پر قاتلانہ
حملہ کیا گیا ہے۔ اور ہم یہ جاننے کی کوشش میں ہیں کہ حملہ
کس نے کیا تھا۔ اسی لیے یہ سفر کیا جا رہا ہے۔
جب کہ آپ نے بتایا ہے کہ آپ کو معلوم ہے، ہم کہاں
جا رہے ہیں اور کیوں جا رہے ہیں۔"

"ہاں! یہ ٹھیک ہے۔ میں جانتی ہوں۔ آپ کو ساری
بات سُن کر بھی میں یہی کہوں گی کہ میں کچھ نہیں بتاؤں گی،
آپ کچھ بھی کر لیں۔"

یہ کہہ کر وہ آگے بڑھ گئی۔

"عجیب ترین بات۔" فاروق بڑبڑایا۔

"کوئی بات نہیں، ہماری زندگیوں میں عجیب ترین باتوں
کے سوا رکھا کیا ہے۔" محمود مسکرایا۔

"اب ہم جہاز میں تو اس کا کچھ بگاڑ بھی نہیں سکتے۔"

"ہم جہاز سے اُتر کر بھی اس کا کچھ نہیں بگاڑیں گے،
صرف یہ معلوم کریں گے کہ اسے کس طرح معلوم ہے کہ ہم
کہاں اور کیوں جا رہے ہیں۔" انسپکٹر جمشید مسکرائے۔

"واقعی۔ ایک عجیب ترین بات ہے۔" خان رحمان بڑبڑائے۔

"اس کا مطلب ہے۔ کیس کی ابتدا جہاز سے ہی ہو
چکی ہے۔"

"خیر جہاز سے تو نہیں۔ کیس کی ابتدا سر ابدال خان سے
ہوئی ہے۔" فرزانہ نے منہ بنایا۔

"اب میں روگان کو بھول کر اس کے بارے میں جاننے کی
کوشش کروں گا۔" انسپکٹر جمشید بڑبڑائے۔

"کیا ایرپورٹ حکام آپ کا حکم مانیں گے؟"

"میں انھیں حکم کیوں دینے لگا۔ میں تو بس اس ایئرہوسٹس
کو قانون کے حوالے کرنے کی بات کروں گا، وہ بھی اس
لیے کہ یہ میری تفتیش میں روڑے اٹکا رہی ہے۔"

"یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ کسی کی ہدایات پر ایسا کر رہی
ہو۔" فرزانہ نے چونک کر کہا۔

"ہاں! اس کا بھی امکان ہے۔" انسپکٹر جمشید نے فوراً سر
ہلا دیا۔

"تب پھر ہمیں اس کیس کا مجرم تلاش کرنے کے لیے اپنے
ملک میں ہی رہنا چاہیے۔ شاید روگان بھی ہماری کوئی مدد
نہیں کر سکے گا۔ صاف ظاہر ہے۔ اس ایئرہوسٹس کا تعلق
ہمارے ملک سے ہے۔ اور اسے جان بوجھ کر ہمیں الجھانے
کی ڈیوٹی سونپی گئی ہے۔" انھوں نے جلدی جلدی کہا۔

"لیکن ابا جان — اب جب کہ ہم یہاں آ گئے ہیں تو تھوڑی سی سیر کر لینے میں کیا حرج ہے اور روگان سے مل لینے میں بھی" فاروق فوراً بولا۔

"بالکل ٹھیک" فرزانہ نے جلدی سے کہا۔

"اچھا بابا — یونہی سہی" انسپکٹر جمشید نے جھنجلا کر کہا۔ پروفیسر داؤد اور خان رحمان مسکرانے لگے — آخر جہاز مشرقی لینڈ کے ایرپورٹ پر اتر گیا — انسپکٹر جمشید کی نظریں ایر ہوسٹس پر جمی تھیں — نہ جانے کیوں، وہ اس کی طرف سے خطرہ سا محسوس کر رہے تھے — اچانک انھوں نے کہا:

"ہم واپس اسی جہاز سے چلیں گے — یہ جہاز اب کل یہاں سے واپس جائے گا، عملہ بھی یہی ہو گا۔"

"اوہ! اس کا مطلب ہے — ہم صرف ایک دن یہاں کی سیر کر سکیں گے۔"

"ایک دن کی سیر تو بہت زیادہ ہوتی ہے بھئی — ہم ایک دو دن اور ٹھہر جاتے، لیکن اس ایر ہوسٹس نے گڑبڑ کر دی۔"

"تب پھر تم واپس چلے جانا جمشید — ہم چند دن ٹھہر کر آئیں گے۔" خان رحمان بولے۔

"نہیں انکل! اس طرح مزا نہیں آئے گا۔" محمود نے جلدی سے کہا۔

"اچھا ٹھیک ہے — جیسے تم لوگوں کی مرضی۔" وہ بھی کندھے اچکا کر رہ گئے۔

وہ لوگ ایرپورٹ سے باہر نکل کر سیدھے روگان کی رہائش پر پہنچے، اس کا گھر تلاش کرنے میں انھیں زیادہ دقت نہیں ہوئی — یہ کام ٹیکسی ڈرائیور نے کر ڈالا — نیچے اتر کر انھوں نے دستک دی — ایک پندرہ سولہ سال کا لڑکا گھر سے باہر نکلا — اس نے سوالیہ انداز میں ان کی طرف دیکھا اور بولا:

"جی — فرمائیے۔"

"ہمیں روگان صاحب سے ملنا ہے۔"

"جی روگان صاحب سے — آپ کہاں سے آئے ہیں؟"

"پاک لینڈ سے۔"

"تشریف لائیے۔" اس نے کہا اور انھیں راستا دیا۔

لڑکا انھیں ڈرائنگ روم میں بٹھا کر باہر نکل گیا:

"اس کا انداز عجیب سا ہے۔" انسپکٹر جمشید بڑبڑائے۔

"آپ کا مطلب ہے — اس لڑکے کا۔" محمود چونکا۔

"ہاں!" وہ بولے۔

دس منٹ گزر گئے، لیکن روگان کمرے میں داخل نہ ہوا — اب تو وہ تنگ آ گئے اور دروازے پر ٹھک ٹھک کرنے لگے — لڑکا پھر اندر آیا:

"جی۔ فرمایئے:"

"بھئی! یہ کیا طریقہ ہے۔ دس منٹ پہلے آپ ہمیں یہاں بٹھا کر گئے تھے اور اب تک مسٹر روگان نہیں آئے۔"

"جناب! آپ کو ابھی پانچ منٹ مزید انتظار کرنا پڑے گا۔ مجھے افسوس ہے۔"

"آخر کیوں۔ کیا وہ گھر میں نہیں ہیں؟"

"ہاں! یہی بات ہے۔" لڑکا بولا۔

"اچھی بات ہے۔ اس صورت میں ہم انتظار کریں گے، لیکن آپ کو پہلے ہی بتا دینا چاہیے تھا۔"

"اسی لیے میں نے کہا ہے نا۔ مجھے افسوس ہے۔"

"آپ ان کے بیٹے ہیں؟" انسپکٹر جمشید نے پوچھا۔

"جی۔ جی ہاں۔" وہ بولا۔

آخر پندرہ منٹ بعد قدموں کی آوازیں سنائی دیں۔ ان سب کی پیشانی پر شکنیں نمودار ہو گئیں، کیونکہ آوازیں کئی آدمیوں کے قدموں کی تھیں۔ اور پھر آٹھ دس پولیس والے اندر داخل ہوئے، وہ انہیں دیکھ کر حیران رہ گئے۔ لڑکا بھی اندر داخل ہوا۔

"یہی ہیں وہ لوگ۔ جو مسٹر روگان سے ملنا چاہتے ہیں۔" انسپکٹر لڑکے کی طرف مڑا۔

"جی ہاں!"

"کیوں جناب! آپ لوگ کون ہیں۔ کہاں سے آئے ہیں اور مسٹر روگان سے آپ کو کیا کام ہے؟"

"لیکن ہمیں ان سے ملوانے کی بجائے پولیس سے کیوں ملوایا جا رہا ہے۔" انسپکٹر جمشید کے لہجے میں حیرت تھی۔

"اس کی وجہ ہے۔ پہلے آپ اپنے بارے میں بتا دیں۔" انسپکٹر نے کہا۔

انسپکٹر جمشید نے اپنے نام وغیرہ بتا دیے، ان کے نام سن کر پولیس اہل کاروں کے چہروں پر حیرت دوڑ گئی:

"کیا واقعی آپ وہی لوگ ہیں۔ جو نام بتائے گئے ہیں؟"

"کارڈ دیکھ لیں۔" انسپکٹر جمشید بولے۔

"ہاں! یہ ٹھیک رہے گا۔"

ان سب نے اپنے کارڈ دکھا دیے۔ آخر اس نے کہا:

"یہ تو معاملہ ہی اور نکل آیا۔ میں تو آپ لوگوں کو گرفتار کرنے آیا تھا۔"

"لیکن کس سلسلے میں؟"

"اس سلسلے میں کہ شاید آپ مسٹر روگان کے قتل کے بارے میں کچھ بتا سکیں۔"

"جی۔ جی!!!"

○

وہ دھک سے رہ گئے۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ روگان کو بھی قتل کر دیا گیا ہوگا۔ گویا اس کیس کا یہ دوسرا قتل تھا۔

"آپ نے کیا فرمایا۔ انھیں قتل کر دیا گیا ہے۔"

"جی ہاں! اور اس سلسلے میں مَیں تفتیش کر رہا ہوں۔ مَیں نے اس بچّے کو ہدایت دی تھی کہ اگر کوئی انھیں پوچھے یا ان سے مُلاقات کرنے آئے تو مجھے فون کر دینا۔"

"او، اچھا۔ مہربانی فرما کر تفصیل بتائیں۔"

"یہ صرف دو دن پہلے کی بات ہے۔ وہ اپنے کمرے میں مردہ ملے۔ انھیں گلا گھونٹ کر ہلاک کیا گیا تھا۔ قاتل رسّی گلے میں ہی چھوڑ گیا تھا۔"

"ہُوں۔ بہت افسوس ہوا یہ سُن کر۔ مسٹر روگان کرتے کیا تھے؟"

"افریقی جنگلوں کی سیر کرانا ان کا پیشہ تھا۔ جو لوگ دوسرے مُلکوں سے افریقہ کے جنگل دیکھنے آتے ہیں، انھیں

کسی رہنما کی ضرورت بھی ہوتی ہے۔ یہ ضرورت وہ پوری کیا کرتے تھے۔"

"ان کی مالی حالت کیا تھی؟"

"مالی حالت بس درمیانے درجے کی تھی۔ تنگ دستی بھی نہیں تھی اور زیادہ خوش حالی بھی نہیں۔" اس نے بتایا۔

"رسّی کے ٹکڑے کے علاوہ کوئی چیز ملی کمرے سے؟" انسپکٹر جمشید نے پُوچھا۔

"نہیں۔ قاتل کی کوئی اور چیز نہیں مل سکی۔ انگلیوں کے نشانات بھی نہیں مل سکے۔ شاید وہ دستانے پہنے ہوئے تھا۔" اس نے بتایا۔

"آپ ہمیں رسّی کا وہ ٹکڑا دکھا سکتے ہیں۔" انھوں نے جلدی سے کہا۔

"ہاں ضرور۔ کیوں نہیں، لیکن آپ کو میرے ساتھ پولیس اسٹیشن جانا ہوگا۔"

انھوں نے لڑکے کے سر پر ہاتھ پھیرا۔ کچھ نقدی اس کے ہاتھ میں تھمائی اور باہر نکل آئے۔ باہر نکلتے وقت انھوں نے دیکھا۔ بچّے کی آنکھوں سے آنسو ٹپ ٹپ گر رہے تھے۔

"آپ نے کچھ اندازہ لگایا۔ مسٹر روگان کو کیوں قتل

بچ گئی؟"

"ابھی تک نہیں — ویسے میرا اندازہ یہ ہے کہ یہ کام [illegible] سیاح کا ہے۔"

"اور بھی سیاح کو ایسا کرنے کی بھلا کیا ضرورت ہو سکتی ہے؟"

"افریقہ کے جنگل بہت پُر اسرار ہیں — ہو سکتا ہے [illegible] سیر کے دوران کوئی پُر اسرار ترین معاملہ پیش آ گیا ہو اور [illegible] معاملے کو راز رکھنے کے لیے ان کا قتل کیا گیا ہو۔"

"ہوں — ضرور کوئی ایسی بات ہے — آپ نے اخبارات میں ڈاکٹر واک کے قتل کے بارے میں پڑھا ہوگا؟"

"جی — جی ہاں — پڑھا تو تھا — لیکن توجہ نہیں [illegible] سکا تھا۔"

"وہ قتل بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے؟"

"جی — کیا مطلب؟" وہ حیران رہ گیا۔

"ہاں! یہ معاملہ تین ملکوں پر پھیلا ہوا لگتا ہے۔"

"چلو اچھا ہے، تینوں ملکوں کی سیر کے مواقع پیدا ہوں گے" فاروق نے فوراً کہا۔

"تینوں ملکوں کے کیسے — بھئی ان میں ایک تو اپنا ملک ہی شامل ہے۔"

"اوہ ہاں! میں حساب میں بالکل کمزور ہوں نا — ساتھ میں اپنا ملک بھی گن گیا؟"

"تم حساب مجھ سے سیکھا کرو۔" فرزانہ نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

"اور الجبرا۔" محمود ہنسا۔

"ارے باپ رے۔" فرزانہ گھبرا گئی۔

انسپکٹر نے انھیں رسی کا وہ ٹکڑا دکھایا — وہ ریشم کا بنا ہوا تھا — اور باریک سا تھا۔

"یہ ہم رکھ تو نہیں سکتے، کیونکہ آپ کو شہادت کے دوران پیش کرنا ہوگا۔"

"جی ہاں!" اس نے کہا۔

"خیر — کوئی بات نہیں — یوں بھی یہ ہمارے کس کام کا۔"

رسی کا اچھی طرح معائنہ کرنے کے بعد وہ وہاں سے لوٹے اور اپنے ہوٹل میں آ گئے — یہاں کے ایک بڑے ہوٹل میں ایک بڑا کمرہ انھوں نے چلنے سے پہلے ہی بک کروا لیا تھا، خان رحمان ٹھہرے ایسے کاموں کے ماہر — لہذا انھیں اپنے کمرے تک پہنچنے میں کوئی دقت نہ ہوئی۔

کچھ دیر آرام کرنے کے بعد وہ شہر کی سیر کے لیے

نکل گئے۔

شیرلی لینڈ عیاش لوگوں کا ملک تھا۔ یہ لوگ اللہ کو نہیں مانتے تھے۔ یہاں کی سیر کے دوران انھیں عجیب سی الجھن کا احساس ہوتا رہا۔ آخر وہ تنگ آ گئے اور واپسی کی ٹھانی۔ لیکن دوسرے دن سے پہلے تو واپسی بھی ممکن نہیں تھی۔ جہاز پر اپنی سیٹیں وہ ایرپورٹ سے نکلنے سے پہلے ہی بک کرا چکے تھے۔

"یہاں آ کر بھی بور ہی ہونا پڑا۔ مسٹر روگان سے بھی ملاقات نہیں کر سکے۔"

"ہاں! لیکن اب ہم کیا کر سکتے ہیں۔" انسپکٹر جمشید نے کندھے اچکا دیے۔

آخر رات کے وقت وہ اپنے کمرے میں لوٹ آئے۔

"میرا جی چاہ رہا ہے۔ میں اڑ کر اپنے وطن پہنچ جاؤں۔" فاروق بولا۔

"تو ہم کل اڑ کر ہی تو جائیں گے۔ ٹرین کے ذریعے تو جائیں گے نہیں۔" فرزانہ نے منہ بنایا۔

"اوہو۔ یہ۔ یہ میں کیا سونگھ رہا ہوں۔ ارے۔" انسپکٹر جمشید زور سے اُچھل پڑے۔

"کک۔ کیا سونگھ رہے ہیں ابا جان۔" فرزانہ نے گھبرا

کر کہا۔

"جلدی کرو۔ کمرے سے نکل جاؤ۔" یہ کہ کر انھوں نے دروازے کی طرف دوڑ لگا دی۔ باقی لوگ بھی دوڑ پڑے۔

لیکن پھر۔ انسپکٹر جمشید دھک سے رہ گئے۔

دروازہ باہر سے بند کر دیا گیا تھا۔

روکو اس کو روکو

"دروازہ باہر سے بند ہے اور اندر گیس چھوڑی جا رہی ہے۔ اگر ہم ایک منٹ سے بھی پہلے نہ نکل گئے تو شاید پھر کبھی نہ نکل سکیں۔" انھوں نے جلدی جلدی کہا۔

"آپ کا مطلب ہے۔ اس صورت میں ہم اسی کمرے میں رہا کریں گے۔" فاروق کے لہجے میں حیرت تھی۔

"یار چپ رہو۔ ان حالات میں بھی تمھیں مذاق کی سوجھ رہی ہے۔" محمود نے تلملا کر کہا۔

اسی وقت انسپکٹر جمشید نے دروازے پر اپنا کندھا دے مارا۔ اس وقت تک وہ بری طرح کھانسنے لگے تھے۔

"اس مرتبہ یا پھر کبھی نہیں۔" انسپکٹر جمشید نے عجیب سے انداز میں پیچھے ہٹتے ہوئے کہا۔ انھیں بھی کھانسی اٹھنے لگی تھی۔ اگرچہ سانس روک رکھا تھا۔ اور پھر وہ پوری قوت سے دروازے سے ٹکرائے۔ دروازہ دھڑام سے گرا۔ اور

وہ باہر نکل گئے۔

برآمدہ سنسان پڑا تھا۔ دور دور تک کوئی بھی نہیں تھا۔ انھوں نے انسپکٹر کو فون کیا۔ وہ آیا تو اس کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔ تفصیل سن کر وہ اور بھی پریشان ہو گیا۔

"اس کا مطلب تو پھر یہ ہے کہ قاتل آپ کے پیچھے بھی لگا ہوا ہے۔"

"ہاں! اس کے سوا کیا کہا جا سکتا ہے۔ آپ مہربانی فرما کر اس دروازے پر سے انگلیوں کے نشانات اٹھوا لیں۔ اور بھی کارروائی پوری کر لیں۔ جہاں ضرورت ہو گی۔ مجھ سے مشورہ کر لیجیے گا۔"

"او کے۔ آپ فکر نہ کریں۔"

آن کی آن میں عملہ حرکت میں آ گیا اور اپنا کام کرنے لگا۔ لیکن اس ساری کارروائی کے نتیجے میں صرف انگلی کا ایک نشان مل سکا۔ اور یہ ضروری نہیں تھا کہ وہ نشان ضرور کسی مجرم کا ہی ہو سکتا ہے۔ وہ کسی غیر متعلق آدمی کا بھی ہو سکتا تھا۔ نشان کی تصویر انھیں بھی دے دی گئی۔

آخر دوسرے دن وہ جہاز پر سوار ہوئے۔ وہی ایر ہوسٹس موجود تھی۔

"منظور جی۔ اب ہم اپنا کام یہیں سے شروع کر دیں گے۔"

"جیسے آپ کی مرضی۔" سب نے ایک ساتھ کہا۔

"تو پھر سب سے پہلا کام۔ اس ایر ہوسٹس کی انگلیوں کے نشانات حاصل کرنا ہے۔ کیا تم تینوں ایسا کر سکو گے؟"

"یہ کیا مشکل ہے ابا جان۔" محمود نے مسکرا کر کہا۔

ان کا سفر شروع ہو گیا۔ ایسے میں محمود نے گھنٹی بجائی۔ ایر ہوسٹس فوراً وہاں پہنچ گئی:

"آپ لوگ واپس جا رہے ہیں؟" اس نے پوچھا۔

"ہاں جی۔ اور یہاں کیا کرتے۔"

"لیکن آپ لوگ تو سیر کرنے کے لیے آئے تھے۔"

"جی بس۔ کر لی۔ خونی سیر۔" محمود نے منہ بنایا۔

"ایک گلاس پانی مل سکے گا شیشے کے گلاس میں۔" فاروق بولا۔

"شیشے کے گلاس میں۔ خیریت۔"

"میں کاغذ کے گلاسوں میں پینا پسند نہیں کرتا۔"

"اچھی بات ہے۔" اس نے منہ بنا کر کہا اور چلی گئی۔ جلد ہی اس کے ہاتھ میں پانی کا گلاس نظر آیا۔ فاروق نے اس گلاس کو کناروں کے قریب سے پکڑ لیا۔ وہ کھڑی رہی۔ گلاس کے انتظار میں۔

"آپ جا سکتی ہیں۔ میں تھوڑا تھوڑا کر کے پینا پسند کرتا

ہوں۔" فاروق نے کہا۔

وہ چلی گئی۔ فاروق نے پانی پیا۔ محمود نے نظر بچا کر ایک خاص قسم کا کاغذ جیب سے نکالا اور ایر ہوسٹس کی انگلیوں کے نشانات پر وہ کاغذ چپکا کر اتار لیا۔ اب اس کی انگلیوں کے نشانات اس کاغذ پر محفوظ ہو چکے تھے۔ اس کاغذ کو احتیاط سے تہ کر کے اس نے پھر جیب میں رکھ لیا۔

"مجرم چاہتا ہے، ہم کوئی ثبوت اس کے خلاف حاصل نہ کرنے پائیں۔" فرزانہ بڑبڑائی۔

"ہو سکتا ہے ہمارا خیال غلط ہو۔ اس نے اب تک جو وارداتیں کی ہیں۔ وہ ہمارے خوف سے نہ کی ہوں، بلکہ اپنی ضرورت کے تحت کی ہوں۔" محمود نے خیال ظاہر کیا۔

"ہاں! اس کا امکان ہے۔"

اسی وقت ایر ہوسٹس ان کے قریب سے گزری:

"گلاس لے جائیے۔"

"میری انگلیوں کے نشانات لے لیے آپ نے؟" وہ طنزیہ انداز میں مسکرائی۔

"اوہو! تو آپ سمجھ گئیں۔"

"میں اور نہ سمجھوں۔ میں تو اڑتی چڑیا کے پر گن لیتی ہوں۔"

وہ عجیب سے انداز میں بولی۔

"تب تو بہت افسوس ہے۔" فاروق نے منہ بنایا۔

"افسوس، لیکن کس بات پر؟" اس کے لہجے میں حیرت تھی۔

"اس بات پر کہ جہاز میں اڑتی چڑیا کہاں سے لائیں؟"

فاروق مسکرایا۔

"یہ کیا بات ہوئی؟"

"ہمارے یہ بہت بڑی مصیبت ہے — بات ذرا مشکل

سے ہوئی ہے۔"

"پتا نہیں، آپ کیا کر رہے ہیں؟"

"یہ ٹھیک ہے، ہم نے آپ کی انگلیوں کے نشانات

حاصل کر لیے ہیں — لیکن آپ کو کیا فکر — آپ تو اڑتی چڑیا کے

پر گن لیتی ہوں۔" محمود مسکرایا۔

"اوہ ہاں! کیوں نہیں۔"

"آپ کا اس کیس سے کیا تعلق ہے؟" فرزانہ نے جلدی

سے کہا۔

"تعلق — کس کیس سے؟"

"سر ابدال خان والے کیس سے۔"

"میں نے یہ نام ضرور سنا ہے — ہو سکتا ہے، کسی دعوت

میں دیکھا بھی ہو، لیکن میں ان کے بارے میں زیادہ نہیں جانتی

"تب پھر آپ نے ہم سے یہ کیوں کہا تھا — آپ جا

ہیں — ہم کہاں جا رہے ہیں۔"

"سی آئی ڈی میں میرے ایک رشتے دار ہیں — کل ہی میری

ان سے ملاقات ہوئی تھی، جب کہ میں اس پرواز پر روانہ

ہونے کی تیاری میں مصروف تھی — انھوں نے ہی آپ

لوگوں کے بارے میں کچھ باتیں بتائی تھیں — میں نے بھی رعب

جھاڑنے کے لیے کہہ دیا کہ میں جانتی ہوں — آپ کہاں اور

کیوں جا رہے ہیں۔"

"اب تو ہم ہو آئے ہیں — آپ بتا دیں — ہم کہاں اور

کیوں گئے تھے۔"

"اگرچہ میرا اس معاملے سے کوئی تعلق نہیں — اور نہ میں

آپ کو کچھ بتانے پر پابند ہوں — پھر بھی میں بتا دیتی

ہوں — میرے اس عزیز نے بتایا تھا کہ آپ لوگ شمری

لینڈ جا رہے ہیں، اسی پرواز سے — اور وہاں یہ لوگ ایک

شخص روگان سے ملنے جا رہے ہیں۔"

"بہت خوب! آپ کے عزیز کافی دلچسپ آدمی ہیں —

جو راز کی باتیں دوسروں کو بتاتے پھرتے ہیں — ان کا نام

بتانا پسند کریں گی آپ؟" انسپکٹر جمشید نے نرم آواز میں کہا۔

"اب آپ انھیں کیا بتانا پسند کریں گے؟"

"صرف انھیں یہ بتانا پسند کروں گا کہ ان کی یہ عادت

اچھی نہیں۔"

"میں آپ کا پیغام انہیں دے دوں گی۔"

"نہیں! ہم اپنا پیغام خود انہیں دیں گے۔" محمود نے سخت
لہجے میں کہا۔

"اگر میں آپ کو ان کا نام اور پتا نہ بتاؤں۔"

"ہم آپ سے زبردستی معلوم کر لیں گے۔"

"ارے نہیں۔ آپ ایسا نہیں کر سکیں گے۔"

"اچھی بات ہے۔ یونہی سہی۔" انسپکٹر جمشید نے کندھے اچکائے
وہ منہ بنا کر آگے چلی گئی۔ آخر جہاز ان کے ملک
کے ایرپورٹ پر اترا۔ انسپکٹر جمشید نے نیچے اترنے میں
بہت جلدی کی۔ جب کہ وہ عام طور پر پہلے دوسروں کو
موقع دینے کے عادی تھے، لیکن آج وہ دوسروں کو ہٹا ہٹا
کر آگے بڑھتے رہے اور جہاز کے دروازے سے نکل گئے۔
ایر ہوسٹس دروازے پر کھڑی ایک مصنوعی مسکراہٹ سے
سب کو الوداع کر رہی تھی۔ انہیں بھی انسپکٹر جمشید کے
پیچھے تیزی سے نکل جانا پڑا۔

"آخر اتنی جلدی کی کیا ضرورت ہے ابا جان؟"

"ضرورت ہے۔ میں اسے نکل کر نہیں جانے دوں گا۔"

وہ فوراً ایرپورٹ کے جنرل منیجر کے کمرے میں پہنچے

وہ انہیں نہیں پہچانتا تھا۔ انسپکٹر جمشید نے اپنا کارڈ دکھایا تو
وہ یک دم اٹھ کر کھڑا ہو گیا:

"فرمایئے جناب! میں کیا خدمت کر سکتا ہوں؟"

"ابھی ابھی جو پرواز شربی لینڈ سے آئی ہے۔ میں اس
کی ایر ہوسٹس سے چند سوالات کرنا چاہتا ہوں۔ سوالات ملکی
نوعیت کے ہیں، لیکن وہ جوابات دینے پر آمادہ نہیں ہیں۔ آپ
انہیں یہاں بلائیں۔"

"اچھی بات ہے۔" اس نے پریشان ہو کر کہا، پھر اپنے
ایک ماتحت کو ہدایات دیں۔ وہ فوراً جہاز کی طرف چلا گیا۔
جلد ہی ایر ہوسٹس اندر داخل ہوئی۔ اس کے چہرے پر سخت
غصے کے آثار تھے:

"سر! میں ان لوگوں کو کچھ نہیں بتاؤں گی۔"

"لیکن ان کا کہنا ہے کہ سوالات ملکی نوعیت کے ہیں۔"

"ہاں بالکل! ملک کا راز اس شخص نے انہیں بتایا ہے۔"

"ملک کا راز۔ کیا مطلب؟" ایر ہوسٹس چونک کر بولی۔ پہلی
مرتبہ اس کی پیشانی پر بل پڑتے نظر آئے۔

"میرے بارے میں کسی کو یہ اطلاع دینا کہ میں کہاں اور
کیوں جا رہا ہوں۔ جب کہ یہ بات میں نے کسی کو نہیں بتائی۔
صرف سرکاری ریکارڈ پر ہے۔ یہ راز بتانے کے برابر ہے۔

اگر آپ کو یقین نہیں تو ہمارے دفتر فون کر کے پوچھ لیں۔"

"ہم ایسا ضرور کریں گے۔" ایر ہوسٹس نے چلا کر کہا۔

"مس فوزیہ درانی۔ آپ کیوں جھگڑا کر رہی ہیں۔ کیا یہ بہتر نہیں ہو گا کہ جو کچھ یہ پوچھنا چاہیں، آپ انھیں بتا دیں۔"

"نہیں سر۔ میں انھیں کچھ نہیں بتاؤں گی۔"

"اگر آپ عورت نہ ہوتیں تو میں اس وقت تک آپ سے یہ باتیں معلوم کر چکا ہوتا۔ خیر کوئی بات نہیں۔ آپ نہ بتائیں گی۔" یہ کہہ کر انسپکٹر جمشید نے اکرام کے نمبر ڈائل کیے اور اسے ہدایات دیں۔

"کیا میں اب جا سکتی ہوں سر۔ کاغذات پر اندراجات کرنے ہیں۔"

"تو تم انھیں کچھ نہیں بتانا چاہتیں؟"

"بالکل نہیں۔"

"جب کہ میری ہدایات یہ ہیں کہ آپ ان کے سوالات کے جوابات دے دیں۔"

"جی ہاں! آپ کی ہدایت یہی ہے۔"

"تو پھر ذمے داری صرف اور صرف آپ پر ہو گی۔" مینیجر نے کہا۔

"ہاں ہاں! آپ فکر نہ کریں۔"

"آپ نے سن لیا صاحبان۔"

"ہاں جناب! اب آپ کا اس معاملے سے کوئی تعلق نہیں رہا۔ ہم خود دیکھ لیں گے۔" فاروق نے منہ بنایا۔

"میرا خیال ہے۔ محترمہ فوزیہ درانی بلا وجہ ضد پر اڑ گئی ہیں۔" مینیجر نے کہا۔

وہ فوراً جلے کٹے انداز میں کمرے سے نکل گئی۔

"آپ ان کے بارے میں کیا کہتے ہیں؟" اس کے جانے کے بعد انسپکٹر جمشید نے اس سے پوچھا۔

"آج سے پہلے تو اس قدر ضدی کبھی نظر نہیں آئیں۔"

"ہوں! آپ ان کا پتا دے دیں۔"

"او، ضرور کیوں نہیں۔ میں آپ سے ہر ممکن تعاون کروں گا۔"

"شکریہ!"

پتا لے کر وہ ایرپورٹ سے نکلے۔ اکرام نے اشارہ دیا۔ وہ اس کی طرف بڑھ گئے۔

"وہ اس بند گاڑی میں موجود ہے سر۔ اور لیڈی پولیس کے درمیان گرفتاری کے وقت خفیہ کیمرے سے تصاویر بھی لی گئی ہیں۔"

"ٹھیک ہے۔ امتحان گاہ میں لے چلو۔ ہر لمحے کی

تصاویر لے جائیں — اور اس سے یہ پوچھا جائے — سپیشل برانچ میں اس کا جو عزیز ہے — اس کا کیا نام ہے —
دوسری بات — سپیشل برانچ کے انچارج کو اطلاع دے دو — کہ اس نام کی ایئر ہوسٹس کو حراست میں لے لیا گیا ہے — ان کے محکمے میں کوئی ان کا عزیز ہے — وہ فوراً آ کر ملاقات کرے۔"

"او کے سر۔"

ایئر ہوسٹس فوزیہ درانی کو وہاں سے سیدھا کمرۂ امتحان میں لے جایا گیا — وہاں صرف عورتیں موجود تھیں — ساتھ میں تصاویر بھی لی جا رہی تھیں — اب اس سے وہ سوال کیا گیا — جو انسپکٹر جمشید کرتے رہے تھے —

"نہیں بتاؤں گی — دیکھتی ہوں — تم کیا کر لیتے ہو۔" اس نے کہا۔

"کرنا کرانا کیا ہے — بس ذرا دو ایک جھٹکے دیں گے آپ کو۔" لیڈی پولیس آفیسر نے مسکرا کر کہا۔

"اور یہ سب ظلم تم اس انسپکٹر کے کہنے پر کرو گی۔" وہ بولی۔

"آپ کس انسپکٹر کی بات کر رہی ہیں؟"

"انسپکٹر جمشید کی۔"

"وہ ہمارے آفیسر ہیں — اور ہمیں انھوں نے آج تک کوئی غلط حکم نہیں دیا۔"

"اب اس کمرے میں جو کچھ میرے ساتھ ہو رہا ہے یا ہوگا — کیا وہ غلط نہیں؟"

"نہیں — جب تک انھیں یہ یقین نہیں ہو جاتا کہ فلاں شخص مجرم ہے — اس وقت تک اسے کمرۂ امتحان میں نہیں آنے دیتے۔"

"تو میں ان کے خیال میں مجرم ہوں؟"

"جی ہاں! اس میں کوئی شک نہیں۔"

"اچھی بات ہے — جو کرنا ہے کر لیں۔"

"ٹھیک ہے۔"

اسے ایک مشین میں بٹھا کر بٹن دبایا گیا — اس کی دل دوز چیخیں فضا میں بکھرنے لگیں —

"روکو — اس کو روکو — میں کہتی ہوں روکو۔" فوزیہ درانی نے چلا کر کہا —

"روک دو بھئی — جب یہ کہتی ہیں۔" لیڈی پولیس انسپکٹر نے مسکرا کر کہا —

بٹن آف کر دیا گیا — اور پھر اس نے تھکے تھکے انداز میں کہا:

"انسپکٹر جمشید کو بلایا جائے ۔ میں ان کے سامنے کہوں گی
جو کہنا ہے ۔"

"وہ بہت مصروف ہیں ۔ نہیں آ سکتے ۔ آپ بتائیں ۔
آپ کے الفاظ ان تک پہنچا دیے جائیں گے ۔"

"بہت چالاک ہیں ، لیکن میں اس ظلم کے خلاف ان پر
مقدمہ ضرور کروں گی ۔"

"ضرور کیجیے گا ۔"

"سنو ! میرے اس عزیز کا نام افلاطون بیگ ہے ۔
اور وہ ۹۰۲ چاند نگر میں رہتا ہے ۔ اب جاؤ اور جا کر اپنا
اطمینان کر لو ۔"

"شکریہ ۔ فون نمبر ؟"

"ہاں ! فون نمبر بھی نوٹ کر لو ۔ ۹۳۳۷۵۶ ۔"

فون نمبر نوٹ کرکے انسپکٹر جمشید کو اطلاع دی گئی ۔ دوسری
طرف سے کہا گیا :

"ٹھیک ہے ۔ ابھی اسے فارغ نہیں کرنا ہے ۔"

یہ سن کر انسپکٹر جمشید نے سپیشل برانچ کے انچارج کو
فون کیا اور پوچھا :

"میں نے جو پیغام دیا تھا ۔ اس کا کیا بنا ؟"

"افلاطون بیگ آپ کے پاس پہنچنے ہی والے ہوں گے

سر ۔" اس نے کہا ۔

"یہ کون صاحب ہیں ؟" وہ حیران ہو کر بولے ۔

"مس فوزیہ درانی کے منگیتر ۔ میرے اسسٹنٹ ۔"

"اوہ اچھا ۔"

عین اس وقت لمبے قد کا ایک اکھڑ سا آدمی کمرے میں
داخل ہوا ، اس کے چہرے پر شدید غصہ تھا ۔

"یہ کہ میں۔ یعنی ہم لوگ شرتی لینڈ کس لیے اور کب جا رہے ہیں؟"

"اوہ!" وہ دھک سے رہ گیا۔

"کیا میں پوچھ سکتا ہوں — آپ نے یہ معلومات کس سے حاصل کیں؟"

"میں نے — آپ کے دفتر گیا تھا ایک کام سے — بابا فضل نے خود ہی یہ باتیں بتا دی تھیں — اور میں نے یہی خیال کیا کہ یہ کوئی راز کی باتیں نہیں ہیں، لہٰذا میں نے فوزیہ سے ذکر کر دیا۔"

"بہت خوب! آپ نے یہ خیال کیا کہ یہ کوئی راز کی باتیں نہیں ہیں — آپ خود بخود یہ خیال کس طرح کر سکتے تھے؟"

"یہاں مجھ سے غلطی ہوئی، لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ آپ اس ذرا سی غلطی کی سزا میری منگیتر کو دیں۔" اس نے منہ بنایا۔

"ایسا ان کی ضد کی وجہ سے ہوا، وہ آپ کا نام بتانے پر تیار نہیں تھیں — اور میں نام معلوم کیے بغیر انھیں چھوڑ نہیں سکتا تھا — لہٰذا انھیں حراست میں لینا پڑا۔" انھوں نے کہا۔

حیرت کی باتیں

"میں نے سُنا ہے — آپ نے فوزیہ کو حراست میں […] رکھا ہے؟"

"آپ نے درست سُنا ہے — وہ تعاون کرنے کے لیے […] نہیں تھیں۔ میں ایک سنگین کیس کی تفتیش کر رہا ہوں ان […]"

"لیکن اس کیس کا تعلق فوزیہ سے کیا ہے؟"

"فوزیہ صاحبہ سے نہیں، آپ سے ہے۔" انسپکٹر جمشید […] نے مسکرا کر کہا۔

"کیا مطلب؟" اس نے چونک کر پوچھا۔

"مطلب یہ کہ آپ نے ایک سرکاری راز اپنی منگیتر […] بتا دیا تھا — جب کہ آپ کو ایسا کرنے کا کوئی […] نہیں تھا۔"

"کون سا راز میں نے بتا دیا اپنی منگیتر کو؟" اس نے جلا کر کہا۔

"اس کا مطلب ہے ۔ ان سے زبردستی یہ باتیں اگلوائی گئیں۔" اس نے آنکھیں نکالیں۔

"ہاں! ہمیں ایسا ہی کرنا پڑا ۔ ہمیں ایسا کرنے پر مجبور ہونا پڑا۔"

"آپ کو اس کے لیے عدالت میں جواب دہ ہونا پڑے گا۔"

"ٹھیک ہے ۔ میں تیار ہوں۔" وہ مسکرائے۔

"تو کیا اب مجھے اجازت ہے؟" اس نے اُٹھتے ہوئے کہا۔

"نہیں جناب! آپ تشریف رکھیے ۔ ابھی آپ سے اصل بات تو کی ہی نہیں۔"

"جی فرمائیے۔" اس نے بیٹھ کر کہا۔

"اچھا خیر ۔ آپ جا سکتے ہیں ۔ اس وقت بہت غصے میں ہیں؟"

"اور فوزیہ؟"

"انھیں بھی فارغ کر دیا گیا ہو گا۔"

"اچھی بات ہے ۔ میں عدالت میں ضرور جاؤں گا۔"

یہ کہہ کر وہ پیر پٹختا ہوا چلا گیا ۔ انھوں نے فوراً ہی بابا فضل کو بُلایا۔

"جی فرمائیے۔" اس نے کہا۔

"بیٹھو بابا۔" وہ نرم آواز میں بولے۔

"جی ۔ بیٹھوں؟" بابا فضل نے حیران ہو کر پوچھا۔

"ہاں ہاں! بیٹھو اور مجھے بتاؤ ۔ تم افلاطون بیگ کو جانتے ہو؟"

"جی ہاں! بہت اچھی طرح۔" اس نے کہا۔

"یعنی مطلب ۔ کیا مسٹر افلاطون عام طور پر آتے رہتے ہیں؟"

"جی ہاں! اکثر علیک سلیک کرنے آ جاتے ہیں۔"

"مطلب یہ کہ ان کا میرے دفتر کے دروازے تک آنا جانا اکثر رہتا ہے؟"

"وہ صرف مجھ سے علیک سلیک کر کے گزر جاتے ہیں ۔ ان کا دفتر بھی ساتھ والی عمارت میں جو ہوا ۔ گزرتے تو ادھر سے ہی ہیں ۔ بس مجھ سے انھیں خاص لگاؤ ہے۔"

"ہاں! یہی میں سوچ رہا ہوں ۔ اچھا میرے شرلی لینڈ جانے کے بارے میں تم نے انھیں بتایا تھا؟"

"جی ہاں! باتوں باتوں میں ذکر آ گیا تھا۔"

"اور یہ ذکر کس طرح آیا تھا؟"

"بس ۔ وہ کہنے لگے ۔ آج یا کل انسپکٹر صاحب کا کہیں جانے کا ارادہ تو نہیں ہے ۔ میرے منہ سے نکل گیا کہ شرلی لینڈ جا رہے ہیں۔"

"ہوں — لیکن میں نے تمہیں یہ نہیں بتایا تھا کہ شہر [illegible]
میں کس لیے آ رہا ہوں اور کس سے ملنے جا رہا ہوں۔"

"ہاں! یہ تو ہے — یہ بات میں نے انھیں نہیں بتائی
تھی۔" بابا فضل بولا۔

"بہت خوب! اس کا مطلب ہے — یہ بات انھوں نے
خود بھی کسی طرح معلوم کی ہو گی — اب سوال یہ ہے کہ کس
طرح؟ ہمارے اس پروگرام کا صرف آئی جی صاحب اور
ڈی آئی جی صاحب کو علم تھا — اوہو میں سمجھ گیا۔" وہ چونک اُٹھے۔
پھر وہ تیزی سے اُٹھے:

"میں ابھی آتا ہوں۔"

وہ سیدھے دفتر پہنچے — آئی جی صاحب کے دروازے پر
موجود چپراسی کو انھوں نے تیز نظروں سے دیکھا:

"دو دن پہلے یہاں افلاطون بیگ آئے تھے — انھیں کیا
باتیں بتائی تھیں؟"

"م — میں نے — جی نہیں تو — وہ —" وہ اٹکنے لگا۔

"تو تم سن گن لیتے رہتے ہو اور پھر افلاطون بیگ کو بتاتے
رہتے ہو۔"

"ن — نہیں۔"

انھوں نے اسے گردن سے پکڑ لیا اور دھکیل کر اندر

لے گئے — آئی جی صاحب اس وقت تنہا تھے، یہ منظر دیکھ
کر چونک اُٹھے:

"یہ — یہ کیا جمشید — اور تم کب آئے؟"

"میں ابھی آیا ہوں سر۔" پھر انھوں نے ساری کہانی کہہ سنائی۔
آئی جی صاحب نے تیز نظروں سے اسے گھورا، پھر بولے:

"جلدی سے سچ اگل دو۔"

"ج ہاں! افلاطون بیگ آتے رہتے ہیں — اور میں جو
باتیں سن پاتا ہوں، انھیں بتاتا رہتا ہوں — وہ مجھے نقدی
کی صورت میں اکثر کافی رقم دیتے رہتے ہیں۔"

آئی جی صاحب نے اسی وقت فون کیا — جلد ہی چپراسی
کے ہاتھ میں ہتھکڑیاں نظر آ رہی تھیں اور پھر افلاطون کو
بھی ان کے کمرے میں لے آیا گیا:

"یہ آج معلوم ہوا کہ ہمارے ملک کے ایسے خاص محکموں
میں بھی دشمن ملکوں کے ایجنٹ موجود ہیں، مثلاً افلاطون۔"
آئی جی صاحب نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

"میں سمجھا نہیں۔"

"میرے چپراسی کو اس وقت تک کتنی رقمیں دے چکے ہو
مسٹر؟" وہ غرائے۔

"اوہ!" وہ دھک سے رہ گیا۔

"اور انسپکٹر جمشید کے چپراسی سے بھی باتوں باتوں میں
باتیں معلوم کر جاتے ہو۔ وہاں چونکہ رشوت نہیں چل سکتی
اس لیے چاپلوسی سے کام نکالتے رہتے ہو۔ اور پھر تم
نے یہ راز کو انسپکٹر جمشید کہاں اور کیوں جا رہے ہیں
درانی کو بتایا۔ اور ان کی نگرانی کی ذمے داری اسے
سونپ دی۔ سوال یہ ہے کہ آخر کیوں؟ اس کیس، یعنی
ابدال خان کیس سے تمھارا کیا تعلق ہے؟"

"میرا اس سے قطعاً کوئی تعلق نہیں، میں تو معلومات
سے فائدہ اٹھانے والا آدمی ہوں۔ ہر قسم کی معلومات حاصل
کرتا رہتا ہوں اور موقعے کی تلاش میں رہتا ہوں کہ کب
کون سی اطلاع میرے لیے مفید ثابت ہو سکتی ہے۔
اس طرح لوگوں سے بہت بڑی بڑی رقمیں وصول کرتا ہوں
مثلاً انسپکٹر جمشید کہیں چھاپہ مارنے کا پروگرام بناتے ہیں
اور میں سن گن لے لیتا ہوں۔ بابا فضل سے باتوں باتوں
میں کچھ معلوم کر لیتا ہوں۔ وہ بھی مجھ سے صرف اس بنا
پر بات کر لیتے ہیں کہ میں سپیشل برانچ کا آدمی ہوں۔ ورنہ
وہ کیوں کسی کو گھاس ڈالنے لگے۔"

"ہوں! تو تم اپنے جرم کا اقرار کر رہے ہو؟"

"ہاں جناب! اس لیے کہ آپ میرا کچھ بھی نہیں بگاڑ

سکیں گے۔ ادھر آپ مجھے جیل بھیجیں گے، ادھر میری ضمانت
ہو جائے گی اور اس کے بعد کیس کی دھجیاں اڑا دینا میرے
وکیل کا کام ہو گا۔ بہت کائیاں ہے میرا وکیل۔"

"سن رہے ہو جمشید؟"

"یس سر۔"

"ایسے آستین کے سانپوں کے بارے میں تم کیا کہتے
ہو؟" انھوں نے کہا۔

"جو آپ حکم دیں۔ آپ فرمائیں تو میں اسے یہاں سے
ہی غائب کرا دوں؟"

"آپ ایسا نہیں کر سکیں گے جناب۔" افلاطون نے طنزیہ
لہجے میں کہا۔

"کیوں نہیں کر سکیں گے؟" انسپکٹر جمشید جھلا کر بولے۔

"اس لیے کہ میری برانچ کے ہر آدمی کو معلوم ہے کہ مجھے
آئی جی صاحب نے بلایا ہے۔ جب میں یہاں سے نہیں لوٹوں
گا، تو وہ پولیس میں بھی رپورٹ درج کرائیں گے کہ آپ
لوگوں نے بلایا تھا، پھر مسٹر افلاطون کسی کو نظر نہیں آئے۔"
اس نے مسکرا کر کہا۔

"تو پھر۔ اس سے کیا ہوتا ہے؟"

"اس سے یہ ہوتا ہے کہ۔ مگر نہیں۔ میں کیوں بتاؤں

کہ اس سے کیا ہوتا ہے:"

"نہ بتاؤ۔ ہم تمہیں غائب کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کرتے۔ عدالت میں تمہارے وکیل کو دیکھ لیں گے۔" انسپکٹر جمشید نے برا سا منہ بنایا۔

"جیسے آپ کی مرضی۔" اس نے کندھے اچکائے۔

دونوں کو جیل بھیج دیا گیا۔ عین اسی وقت فون کی گھنٹی بجی۔ آئی جی صاحب کے آپریٹر نے بتایا کہ انسپکٹر جمشید کا فون ہے۔ انھوں نے ریسیور اٹھا لیا:

"ہیلو۔ میں سر ابدال بول رہا ہوں۔ انسپکٹر جمشید صاحب، جلدی آئیں۔"

"کیا ہوا جناب۔ خیر تو ہے؟"

"نہیں۔ خیر نہیں ہے۔" انھوں نے کہا اور ریسیور رکھ دیا۔

انسپکٹر جمشید اٹھ کھڑے ہوئے۔

○

سر ابدال خان نے بے تابانہ انداز میں انسپکٹر جمشید کا استقبال کیا اور بولے:

"ڈاکٹر واک مارے گئے۔ دوکان مارا گیا۔ اور اب میری

باری ہے:"

"جی وہ کیسے؟"

"وہ ایسے کہ ابھی ابھی مجھ پر دو عدد سانپ چھوڑے گئے ہیں۔ سانپ میرے کمرے کے فرش پر رینگ رہے تھے۔ اور خاص بات بتاؤں۔" انھوں نے خوف زدہ آواز میں کہا۔

"جی۔ ضرور بتائیں۔"

"دونوں سانپ افریقی ہیں۔ میں نے افریقہ کے اس جنگل میں ایسے سانپ بہت دیکھے ہیں، لیکن ہماری طرف ایسے سانپ ہرگز نہیں ہوتے اور سنا ہے۔ ان کا ڈسا واقعی پانی نہیں مانگتا۔"

"حیرت ہے۔ اس وقت وہ کہاں ہیں؟"

"میرے کمرے میں ہی کہیں ہوں گے۔ میں تو فوراً باہر نکل آیا تھا۔ اور سب گھر والوں کو ادھر ڈرائنگ روم میں جمع کر لیا تھا۔ خود باہر آ کر کھڑا ہو گیا۔ اب گھر کے افراد ڈرائنگ میں بند ہیں۔ اس کے دروازے فرش کے بالکل ساتھ لگے ہوئے ہیں اور کوئی اور سوراخ وغیرہ بھی ایسا نہیں ہے۔ جس سے سانپ ڈرائنگ روم میں داخل ہو سکیں۔ لہٰذا وہ محفوظ ہیں۔"

"یہ تو الجھن ہو گئی۔ اب سانپوں کو تلاش کرنا پڑے

گا۔" انسپکٹر جمشید نے منہ بنایا۔

"تو پھر۔ کسی سپیرے کو بلائیں۔"

"ہاں! بہتر تو یہی رہے گا۔ آپ اور آپ کے گھر والے
عارضی طور پر کسی دوست کے گھر چلے جائیں۔ سپیرا آ کر
سانپوں کو پکڑے گا، لیکن اس سے کہہ دیجیے گا۔ وہ سانپوں
کو مار نہ ڈالے۔ ہمیں زندہ سانپ چاہییں۔"

"لیکن۔ ہم زندہ سانپوں کا کیا کریں گے؟" انھوں نے
ڈرے ڈرے انداز میں کہا۔

"بطور ثبوت مجرم کے خلاف پیش کریں گے۔ اور ہاں
اگر آپ کی واقفیت کسی سپیرے سے نہیں ہے تو میں بلا
لیتا ہوں ایک عدد سپیرے کو۔ وہ میرا دوست ہے۔"

"یہ۔ یہ تو اور اچھی بات ہے۔ جلدی کریں، لیکن ہم
کسی دوست کے گھر کیوں منتقل ہوں۔ ہم ڈرائنگ روم
میں محفوظ ہیں۔"

"جیسے آپ کی مرضی۔ اگر سانپ پکڑے نہ جا سکے۔ تو
پھر آپ کیا کریں گے؟"

"پھر ہم چلے جائیں گے۔"

"اچھی بات ہے۔ میں فون کرتا ہوں۔"

جلد ہی ایک ماہر سپیرا وہاں آ موجود ہوا۔ وہ واقعی

انسپکٹر جمشید کا پرانا واقف تھا اور کئی مرتبہ اس قسم کے
کیسوں میں اس کی ضرورت پڑی تھی۔ سانپ پکڑنے میں
بہت ماہر تھا، نام تھا خانو پھنیر۔

"بھئی خانو پھنیر۔ تم تو خود پھنیر ہو۔ سانپوں سے تو کیا
ڈرتے ہو گے۔"

"توبہ کریں جی۔ سانپ تو مجھ سے ڈرتے ہیں۔ اور
پھر راز کی بات ہے صاحب جی۔ صرف آپ کو بتا رہا
ہوں۔ میں سانپ کا زہر استعمال کرتا رہتا ہوں۔ ان
حالات میں اگر مجھے کوئی سانپ کاٹ بھی لے تو اس کا زہر
اثر نہیں کرے گا۔"

"چاہے کسی بھی قسم کا سانپ ہو؟" انسپکٹر جمشید بولے۔

"ہاں بالکل۔" اس نے فخریہ انداز میں کہا۔

"چاہے افریقہ کا ہی کیوں نہ ہو؟"

"ارے باپ رے۔ افریقہ کے سانپوں کی بات نہیں
کر رہا میں۔" اس نے کانپ کر کہا۔

"کیا مطلب۔ یہ کیا بات ہوئی۔ ابھی تم کیا کہہ رہے
تھے۔" انھوں نے کہا۔

"میں اپنی طرف کے سانپوں کی بات کر رہا تھا جناب۔"

"لیکن بھئی۔ ہماری طرف کے سانپ بھی تو بہت

بہت زہریلے ہوتے ہیں۔ عجیب و غریب داستانیں سننے میں آتی ہیں ان کے بارے میں۔"

"یہ سب ٹھیک ہے، لیکن جناب، افریقہ کے سانپ ان سب سے اوپر ہیں۔ اور اگر اس کوٹھی میں افریقی سانپ آگھسے ہیں۔ لیکن۔ بھلا افریقی سانپ یہاں کہاں سے آ گئے۔ اور آپ کو کس طرح معلوم ہو گیا کہ وہ سانپ افریقہ کے ہیں؟"

انسپکٹر جمشید نے اسے مختصر طور پر بتایا۔ آخر خاور بخیر نے کہا:

"ان حالات میں میں یہ کام نہیں کروں گا جناب۔ آپ کسی اور کو بلائیں۔ افریقہ کے سانپ بجلی کی سی تیزی سے حرکت میں آتے ہیں۔ گویا ہوا میں اڑتے ہوئے اور ڈس کر دُور چلے جاتے ہیں۔"

"بھئی آج تو تم مایوس کیے دے رہے ہو۔"

"ان حالات میں میں کر بھی کیا سکتا ہوں۔ بات دراصل یہ ہے جناب کہ مقامی سانپوں کے زہر تو میں استعمال کر چکا ہوں، لیکن افریقی سانپوں کا زہر میں نے آج تک استعمال نہیں کیا۔ اگر ان میں سے کسی نے مجھے ڈس لیا تو فوری طور پر میری موت واقع ہو جائے گی۔"

"اچھا تو پھر کسی ایسے سپیرے کا نام پتا بتاؤ۔ جو یہ کام کر سکے۔"

"سچی بات بتاؤں سر؟"

"ہاں ضرور۔" وہ بولے۔

"افریقی سانپوں کو پکڑنے پر کوئی بھی تیار نہیں ہو گا۔ اس میں موت کے امکانات ننانوے فی صد ہوتے ہیں اور بچنے کے امکانات صرف ایک فی صد۔"

"اچھا بھائی۔ تم باہر بیٹھ کر بین تو بجا ہی سکتے ہو۔" انھوں نے جھلا کر کہا۔

"بین کی آواز کا سانپ پر کوئی اثر نہیں ہوتا۔ یہ صرف کہانیاں ہیں کہ بین کی آواز سن کر سانپ مست ہو جاتا ہے اور اس حالت میں اسے پکڑنا آسان ہو جاتا ہے۔ ایسی کوئی بات نہیں ہے۔"

"ہوں اچھا ٹھیک ہے۔ تم جاؤ۔ میرے ذہن میں ترکیب آ گئی ہے۔" انسپکٹر جمشید نے مسکرا کر کہا۔

"ترکیب۔ کیا مطلب۔ کیا آپ خود پکڑیں گے؟"

"مجھے بھی افریقی سانپوں کو پکڑنے کا کوئی تجربہ نہیں ہے، بہرحال میں انھیں پکڑوں گا ضرور۔"

"تو پھر صاحب جی، مجھے بھی یہیں رہنے دیں۔ میں

ان سانپوں کو دیکھنا چاہتا ہوں۔"

"ابھی تو خوف کھا رہے تھے۔"

"باہر رہ کر خوف نہیں کھاؤں گا اور جب آپ ان کو پکڑ لیں گے تو پھر میں ان کو نہ صرف دیکھ سکتا ہوں، بلکہ آپ سے وصول بھی کر سکتا ہوں۔" اس نے مسکرا کر کہا۔

"اوہ اچھا — تم چاہتے ہو، میں وہ سانپ پکڑ کر تمھارے حوالے کر دوں۔"

"ہاں جی! اس میں آپ کا کیا نقصان ہے؟" سپیرا جلدی سے بولا۔

"میرا تو نہیں — دوسروں کو نقصان پہنچ سکتا ہے، لہٰذا میں وہ سانپ تمھارے حوالے نہیں کروں گا۔"

"تو پھر — کیا آپ ان کو مار ڈالیں گے؟"

"میں اتنا بے وقوف نہیں۔" وہ مسکرائے۔

"اوہ میں سمجھ گیا — آپ کسی اور کو سانپ فروخت کر دیں گے۔"

"ہاں! تم یہ سمجھ سکتے ہو۔" انھوں نے کہا اور فون کی طرف متوجہ ہو گئے:

"السلام علیکم پروفیسر صاحب — دو عدد سانپ پکڑنے کا پروگرام ہے — سانپ انتہائی خطرناک ہیں — اور کوئی سپیرا ان

کے نزدیک جانے کے لیے تیار نہیں ہے۔"

"اجی جمشید — کیا میں سپیرا ہوں؟"

"آپ تو پورے ملک کے سب سے بڑے سپیرے ثابت ہو سکتے ہیں۔"

"میں سمجھ گیا — اور آ رہا ہوں۔" انھوں نے کہا۔

جلد ہی پروفیسر داؤد چند آلات لے کر وہاں پہنچ گئے:

"آؤ جمشید — ہم دونوں مل کر ان دونوں کو پکڑیں گے۔"

یہ کہہ کر انھوں نے اپنے اور ان کے اوپر کسی گیس کا سپرے کیا اور اندر داخل ہو گئے — پانچ منٹ بعد وہ واپس آئے تو بے ہوش سانپ ان کے ہاتھوں میں لٹک رہے تھے — یہ بھورے رنگ کے چھوٹے چھوٹے سانپ تھے۔

"یہ ہیں وہ خطرناک ترین سانپ۔" انسپکٹر جمشید مسکرائے۔

"کمال ہے — کیا یہ مر گئے ہیں؟"

"نہیں! صرف بے ہوش ہیں — اور اب میں انھیں چڑیا گھر کے حوالے کروں گا — تاکہ لوگ ان کو دیکھ سکیں۔"

"اوہ!" سپیرا حیران رہ گیا۔

سانپوں کو ایک ڈبے میں بند کر کے چڑیا گھر کے منیجر کو فون کر دیا گیا — اس کے بعد کوٹھی کی طرف متوجہ ہوئے

"سر ابدال! اب پانی سر سے اونچا ہو گیا ہے —"

ان سانپوں کو دیکھنا چاہیے۔"

"ابھی تو خوف کھا رہے تھے۔"

"باہر رہ کر خوف نہیں کھاؤں گا اور جب آپ ان کو پکڑ لیں گے تو پھر میں ان کو نہ صرف دیکھ سکتا ہوں، بلکہ آپ سے وصول بھی کر سکتا ہوں۔" اس نے مسکرا کر کہا۔

"اوہ سمجھا۔ تم چاہتے ہو، میں وہ سانپ پکڑ کر تمھارے حوالے کر دوں۔"

"ہاں جی! اس میں آپ کا کیا نقصان ہے؟" سپیرا جلدی سے بولا۔

"میرا تو نہیں۔ دوسروں کو نقصان پہنچ سکتا ہے، لہٰذا وہ سانپ تمھارے حوالے نہیں کروں گا۔"

"تو پھر۔ کیا آپ ان کو مار ڈالیں گے؟"

"میں اتنا بے وقوف نہیں۔" وہ مسکرائے۔

"اوہ میں سمجھ گیا۔ آپ کسی اور کو سانپ فروخت کر دیں گے۔"

"ہاں! تم یہ سمجھ سکتے ہو۔" انھوں نے کہا اور فون کی طرف متوجہ ہو گئے:

"السلام علیکم پروفیسر صاحب۔ دو عدد سانپ پکڑنے کا پروگرام ہے۔ سانپ انتہائی خطرناک ہیں۔ اور کوئی سپیرا ان کے نزدیک جانے کے لیے تیار نہیں ہے۔"

"اچھا جمشید۔ کیا میں سپیرا ہوں؟"

"آپ تو پورے ملک کے سب سے بڑے سپیرے ثابت ہو سکتے ہیں۔"

"میں سمجھ گیا۔ اور آ رہا ہوں۔" انھوں نے کہا۔

جلد ہی پروفیسر داؤد چند آلات لے کر وہاں پہنچ گئے۔

"آؤ جمشید۔ ہم دونوں مل کر ان دونوں کو پکڑیں گے۔"

یہ کہہ کر انھوں نے اپنے اور ان کے اوپر کسی گیس کا سپرے کیا اور اندر داخل ہو گئے۔ پانچ منٹ بعد وہ واپس آئے تو بے ہوش سانپ ان کے ہاتھوں میں لٹک رہے تھے۔ یہ بھورے رنگ کے چھوٹے چھوٹے سانپ تھے۔

"یہ ہیں وہ خطرناک ترین سانپ۔" انسپکٹر جمشید مسکرائے۔

"کمال ہے۔ کیا یہ مر گئے ہیں؟"

"نہیں! صرف بے ہوش ہیں۔ اور اب میں انھیں چڑیا گھر کے حوالے کروں گا۔ تاکہ لوگ ان کو دیکھ سکیں۔"

"اوہ!" سپیرا حیران رہ گیا۔

سانپوں کو ایک ڈبے میں بند کر کے چڑیا گھر کے منیجر کو فون کر دیا گیا۔ اس کے بعد کوٹھی کی طرف متوجہ ہوئے:

"سر ابدال! اب پانی سر سے اونچا ہو گیا ہے۔"

"میں اب آپ کے ان ساتھیوں کو چیک کیے بغیر نہیں رہ... جو آپ کے ساتھ افریقہ گئے تھے - آپ مجھے صرف... دیں - وہاں کیا خاص واقعہ پیش آیا تھا؟"

"میں کہہ چکا ہوں - وہاں کوئی خاص واقعہ پیش نہیں آیا..."

"تو پھر یہ سب کیا ہو رہا ہے؟"

"میں خود حیران ہوں۔" وہ بولے۔

"گویا آپ کچھ بتائیں گے نہیں؟"

"آخر میں کیا بتاؤں؟"

"تو پھر سن لیں - وہاں کوئی نہ کوئی واقعہ پیش ضرور آیا ہے۔"

"یہ آپ کا دعویٰ ہے - آپ اسے ثابت کر دکھائیں۔"

"اچھی بات ہے۔" انھوں نے کہا اور پوری کوٹھی کا جا... لیا، لیکن یہ نہ جان سکے کہ سانپ کوٹھی کے اندر کس طرح داخل کیے گئے۔

"آپ سے کوئی ملنے آیا تھا؟"

"نہیں - آج صبح سے اب تک کوئی ملنے نہیں آیا۔ ہاں گھر کی بجلی فیل ہو گئی تھی - ایک الیکٹریشن کو بلایا گیا تھا۔" انھوں نے کہا۔

"بہت خوب! اس کا فون نمبر؟"

"یہاں ہمارے پڑوس میں ہی دکان کرتا ہے۔"

"اور وہ اپنا تھیلا ساتھ لایا تھا؟"

"ظاہر ہے۔"

وہ الیکٹریشن کی دکان پر گئے، لیکن دکان پر تالا لگا ہوا تھا اور اس کے گھر کے بارے میں کسی کو معلوم نہیں تھا - آخر تھک ہار کر انسپکٹر جمشید اور پروفیسر داؤد گھر آ گئے۔

خان رحمان بچوں کے ساتھ گپوں میں مصروف تھے:

"کیا کر آئے ابا جان؟"

"کچھ بھی نہیں کر کے آ سکے - شاید اس لیے کہ تم ساتھ نہیں آئے - جب تم ساتھ ہوتے ہو تو کوئی نہ کوئی بات کرتے رہتے ہو اور ان باتوں سے کسی کا کوئی سرا ہاتھ آ جاتا ہے۔" انھوں نے منہ بنا کر کہا۔

"آپ ہمیں بتائیں - ہم سرا ڈھونڈ لاتے ہیں ابھی۔"

"کیا بتاؤں؟"

"اس وقت تک جو کچھ بھی آپ نے کیا ہے۔"

انھوں نے سانپ پکڑنے کے بارے میں بتا دیا۔

"گویا آپ کا خیال یہ ہے کہ افریقہ کے سفر کے دوران کوئی خاص واقعہ پیش آیا ہے، لیکن سر ابدال خان بتانے پر آمادہ نہیں ہیں۔" محمود نے سوچ میں گم لہجے میں کہا۔

"ہاں! یہ کام کی بات ہے۔"

"تو سفر کے دوسرے ساتھیوں کو کیوں نہ ٹٹولا جائے

بارے میں ہم اپنے طور پر معلوم کر چکے ہیں۔"

"اب ہم یہی کریں گے۔"

عین اس وقت فون کی گھنٹی بجی۔ دوسری طرف سے

کر رہے تھے:

"بھئی جمشید۔ غضب ہو گیا۔ میرے دوست طالب کا

کے گال پر نیلا چاند ابھر آیا ہے۔"

"جی۔ کیا فرمایا۔ طالب کامرانی۔ یہ تو شاید سر ابدال کے

ساتھ افریقہ کے سفر پر گئے تھے۔"

"ہاں جمشید۔ تم نے بالکل ٹھیک کہا۔ میں ابھی

سے بول رہا ہوں۔ مہربانی فرما کر جلد آ جائیں۔"

"او کے سر۔ ہم ابھی آ رہے ہیں۔"

ریسیور رکھ کر انھوں نے یہ خبر سنائی اور پھر اٹھ کھڑے

ہوئے۔ طالب کامرانی ایک سیاح قسم کے آدمی تھے۔

سال میں نو ماہ سفر پر رہتے تھے اور تین ماہ اپنے گھر

میں۔ جب وہ ان کے کمرے میں داخل ہوئے تو ان کے

بیوی بچے دوسرے دروازے سے نکل گئے۔ انھوں نے

بالکل ویسا ہی ایک چاند ان کے گال پر دیکھا، جیسا

سر ابدال کے گال پر تھا:

"کیا آپ اس چاند کا مطلب سمجھتے ہیں؟"

"ہاں! میں ابدال خان کے گال پر دیکھ چکا ہوں۔"

"میرا مطلب ہے۔ اس سے پہلے جب آپ افریقہ کے سفر پر گئے تھے تو اس چاند کے بارے میں آپ کو بتایا گیا تھا نا؟"

"ہاں! روگان نے بتایا تھا۔"

"تو پھر۔ اب آپ کیا کہتے ہیں۔ ڈاکٹر واک کو ہلاک کر دیا گیا ہے۔ ان کے پاس اس زہر کے علاج کے انجکشن تھے۔ وہ انجکشن یہاں لائے گئے، لیکن ان کو چرا لیا گیا، اب آپ کو بچایا جائے تو کس طرح؟"

"میں ان سب باتوں کو جانتا ہوں۔ میں جانتا ہوں، یہاں کے ڈاکٹروں کے پاس اس کا کوئی علاج نہیں ہے۔ لیکن میرے ایک مہربان ڈاکٹر کا کہنا ہے کہ اگر میں سارے بدن کا خون تبدیل کرا لوں تو شاید میں بچ سکوں۔"

"تو پھر فوری طور پر ایسا کرا لیں۔"

"ہاں! بس۔ ایمبولینس آنے ہی والی ہے۔"

"آپ مجھے صرف یہ بتا دیں۔ افریقہ کے سفر کے دوران کیا ہوا تھا؟"

"یہی ہوا تھا — کچھ بھی نہیں ہوا تھا" وہ بولے۔

"آپ کا مطلب ہے — کوئی واقعہ پیش نہیں آیا تھا؟"

"ہاں! بالکل نہیں۔"

"سر ابدال کا کہنا بھی یہی ہے۔"

"اور میرا کہنا غلط نہیں ہے" سر ابدال فوراً بولے — ...

بھی ابھی کمرے میں داخل ہوئے تھے — ان کے چہرے پر

حد درجے خوف تھا —

"اوہ، تو آپ بھی یہاں آ گئے — شاید انھیں یہ اشارہ

کرنے کہ کچھ نہ بتائیں۔"

"جی — نہیں — اگر آپ کا خیال یہ ہے تو میں دوسرے

کمرے میں چلا جاتا ہوں" سر ابدال نے فوراً کہا۔

"ہاں ضرور" انسپکٹر جمشید سرد اور خشک لہجے میں کہا۔

وہ بُرا سا منہ بنا کر دوسرے کمرے میں چلے گئے۔

"آپ نے میرے دوست کو ناراض کر دیا۔"

"آپ کی زندگی خطرے میں ہے — اگر آپ بتا دیں

افریقہ میں کیا ہوا تھا تو شاید ہم آپ کو بچا سکیں۔"

"وہاں کچھ ہوا ہو تو بتاؤں نا" انھوں نے جھلا کر کہا۔

اسی وقت ایمبولینس آ گئی اور انھیں لے جانے کی تیاری

ہونے لگی — آخر وہ چلے گئے — صرف انسپکٹر جمشید اور ا

کے ساتھی وہاں رہ گئے۔

"اب ہم یہاں رک کر کیا کریں گے ابا جان — آئیے چلیں۔"

"میں ایک بات سوچ رہا ہوں — اور وہ یہ کہ طالب

کامرانی اس وقت تک اس خیال میں ہیں کہ انھیں بچا لیا

جائے گا — اگر کہیں انھیں یہ احساس ہو جائے کہ وہ بچ

نہیں سکیں گے تو شاید موت کا خوف انھیں بتانے پر مجبور

کر دے۔"

"ہاں! ٹھیک ہے، لیکن ہم انھیں یہ احساس کس طرح

دلا سکتے ہیں جمشید" خان رحمان بولے۔

"پہلے میں ان ڈاکٹروں سے بات کروں گا — جو ان کا خون

تبدیل کرنے والے ہیں — آؤ چلیں۔"

انھوں نے خفیہ انداز میں ان دونوں ڈاکٹرز سے ملاقات

کی — اس ملاقات پر وہ کافی حیران تھے — انسپکٹر جمشید نے

انھیں مختصر طور پر بتایا کہ کیا معاملہ ہے اور وہ کیا چاہتے

ہیں — اس پر ان میں سے ایک نے کہا:

"کیا آپ یہ چاہتے ہیں کہ میں انھیں یہ بتاؤں، وہ نہیں

بچ سکیں گے۔"

"ہاں! اس وقت تک انھیں پوری امید ہے کہ خون تبدیل

کرکے انھیں بچا لیا جائے گا، اس لیے یہ وہ راز نہیں

بتا رہے ہے۔ اور جب تک وہ راز معلوم نہیں ہو جائے گا، اس وقت تک یہ لوگ نیلے چاند کا شکار ہوتے رہیں گے۔"

"نی۔ نیلے چاند کا شکار۔" فاروق بڑبڑایا۔

"چپ۔ اس وقت بہت سنجیدہ گفتگو ہو رہی ہے۔" انسپکٹر جمشید غرائے۔

"لیکن جناب۔ ایک ڈاکٹر مریض سے یہ کس طرح کہہ سکتا ہے کہ وہ بچ نہیں سکے گا۔ ڈاکٹر کو اگر یہ بات معلوم ہو جائے۔ تو بھی اس کو آخر وقت تک یہی کہنا پڑتا ہے کہ فکر نہ کریں، آپ اچھے ہو جائیں گے۔" اس نے کہا۔

"آپ ٹھیک کہتے ہیں، لیکن یہاں ایک بہت بڑی مجبوری ہے۔ اور وہ یہ کچھ آدمیوں کی زندگیاں خطرے میں ہیں۔ کیا آپ چاہتے ہیں۔ وہ بھی نیلے چاند کا شکار ہو جائیں۔" انھوں نے کہا۔

"جی نہیں۔ بھلا میں کیوں چاہوں گا۔" اس نے گھبرا کر کہا۔

"اگر آپ نہیں چاہتے تو پھر ان کی زندگیوں کو بچانے کے لیے ہمیں اس کی راز کی ضرورت ہے۔ اور یہ راز طالب کامرانی صرف اس صورت میں بتا سکتا ہے جب اسے یقین دلا دیا جائے کہ وہ اب بچ نہیں سکے گا۔"

"اچھی بات ہے۔ میں یہ کر دیتا ہوں۔ لیکن ہر طرح کی ذمے داری آپ پر ہو گی۔"

"ہاں ہاں! آپ فکر نہ کریں۔" وہ مسکرا دیے۔

"تو پھر آئیے میرے ساتھ۔"

"نہیں! ہمارا ان کے سامنے جانا درست نہیں۔ ہم چھپ کر بات چیت سنیں گے۔ ساتھ والے کمرے میں۔"

"ٹھیک ہے۔ میں اس کا انتظام بھی کرا دیتا ہوں کہ آپ گفت گو سن سکیں۔"

تھوڑی دیر بعد وہ ساتھ والے کمرے میں دروازہ تھوڑا سا کھول کر بیٹھے ہوئے تھے اور کمرے میں ڈاکٹر طالب کامرانی کے پاس بیٹھا تھا۔ انھوں نے سنا، ڈاکٹر نے بات شروع کرتے ہوئے کہا:

"ہم آپ کا خون تبدیل تو کر رہے ہیں، لیکن..." وہ کہتے کہتے رک گیا۔

"لیکن کیا؟" طالب کامرانی نے چونک کر کہا۔

"لیکن ہم آپ کو یہ بھی بتا دینا پسند کریں گے کہ اس میں آپ کے بچنے کا امکان صرف ایک فی صد ہے۔"

"کیا!!! پہلے تو آپ کہہ رہے تھے کہ بچنے کے امکانات پچھتر فی صد ہیں۔"

"میں نے جو حقیقت ہے ، وہ بتا دی - ایک فی صد سے
زیادہ امکان نہیں ہے۔"

"اوہ! وہ بولے -

"لہٰذا میں چاہتا ہوں - آپ کو اگر کسی عزیز ، رشتے دار
یا کسی دوست سے کوئی بات کرنا ہے تو خون تبدیل ہونے
سے پہلے پہلے کر لیں۔"

"میں اپنے گھر والوں سے ملنا پسند کروں گا۔"

"اور دوستوں سے بھی ؟"

"ہاں ! میں ان کے نام اور فون نمبر لکھ دیتا ہوں -
آپ سب کو فون کر دیں۔"

"اچھی بات ہے۔"

آدھ گھنٹے بعد سب لوگ وہاں آ گئے - طالب کامرانی
نے انہیں بتایا :

"ڈاکٹر صاحبان کا کہنا ہے - میں شاید بچ نہ سکوں گا۔"

"نہیں نہیں - یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں۔" اس کے گھر
والے چلائے - دوست بھی بول اٹھے :

"ایسی کوئی بات نہیں ، جب خون تبدیل ہو جائے گا تو
اس زہر کا اثر نہیں رہ جائے گا۔"

"یہ ڈاکٹر صاحبان کی بات ہے - میں صرف یہ کہنا چاہتا

ہوں کہ میرے سب دوست میرے بچوں کا خیال رکھیں۔"

"اور ہم کہتے ہیں - تم ٹھیک ہو جاؤ گے۔"

"اور میرے ذمے اگر کسی کی کوئی رقم یا کوئی اور چیز ہے -
وہ مجھ سے لے لیں - اس وقت میں دے سکتا ہوں۔"

کمرے میں غم کی فضا طاری ہو گئی - ایسے میں انسپکٹر جمشید
اچانک کمرے میں داخل ہو گئے اور بول اٹھے :

"اگر یہ بات ہے تو پھر آپ دنیا سے رخصت ہوتے ہوئے
اپنے آٹھ نو ساتھیوں کی زندگیاں کیوں خطرے میں ڈال رہے ہیں؟"

"کیا کہا - میں خطرے میں ڈال رہا ہوں۔" طالب کامرانی نے
گھبرا کر کہا -

"ہاں بالکل ! اس لیے کہ افریقہ کی سیاحت کے دوران
کوئی واقعہ ضرور ہوا تھا - قتل کی دو وارداتیں اس سلسلے
میں ہو چکی ہیں - سر اجمال خان بھی اگر افریقہ پہنچ کر ڈاکٹر
واک سے انجکشن نہ لگواتے تو شاید یہ بھی اس وقت اس دنیا
میں نہ ہوتے - باقی لوگ بھی جو اس سیاحت کے موقعے
پر ساتھ تھے - خطرے میں ہیں - قاتل انہیں بھی نہیں چھوڑے
گا - طالب کامرانی صاحب کے بعد کسی اور کے گال پر نیلا
چاند ابھر آئے گا - اگر آپ چاہتے ہیں کہ ایسا نہ ہو تو
پھر یہ بتا دیں - وہاں کیا ہوا تھا - کیونکہ آپ کے تو بچنے

"امکانات ہی نہیں" انھوں نے کہا:
کمرے میں سناٹا چھا گیا۔ سب کی نظریں اب طالب کامرانی
پر لگی تھیں۔ آخر اس نے کہا:
"افریقہ کی سیر کے دوران کوئی خاص واقعہ پیش آیا ہو
نہیں تو بتاؤں کیا؟"
"تب پھر نیلے رنگ کا یہ چاند آپ کے گال پر کیوں نظر
آ رہا ہے۔ کیا آپ نے غلطی سے کسی کانٹے کو چھو لیا تھا
اور پھر وہ کانٹا آپ کے پاس آیا کس طرح؟"
"میں نے کسی کانٹے کو ہاتھ نہیں لگایا۔ کسی نے میرے
جسم میں چبھو دیا ہوگا"
"بہت خوب! سوال یہ ہے کس نے۔ آپ نے ان دو
تین دنوں میں کس کس سے ملاقات کی ہے۔ میرا مطلب ہے
ان میں سے جو اس وقت یہاں موجود ہیں اور جو آپ کے ساتھ
افریقہ کے سفر میں بھی تھے"
طالب کامرانی نے ان سب پر ایک نظر ڈالی اور پھر
بھرائی ہوئی آواز میں بولے:
"یہ بات بھی میری سمجھ سے باہر ہے۔ ہاں میں ایک
غیر اہم واقعے کے بارے میں ضرور بتا سکتا ہوں"
"چلیے آپ غیر اہم ہی بتا دیں۔ اہم اسے ہم خود بنا لیں

گے" فاروق بول اٹھا۔ وہ لوگ بھی اب اس کمرے سے اس
کمرے میں آ گئے تھے۔
"ہوں! ٹھیک ہے۔ ایک روز ہم سب افریقہ کے ایک
خطرناک جنگل سے گزر رہے تھے۔ اس وقت روگان بھی ہمارے
ساتھ تھا ——— اچانک روگان کی نظر ایک افریقی
سانپ پر پڑی"
"کیا کہا۔ افریقی سانپ پر" انسپکٹر جمشید چونک اٹھے،
ابھی ابھی تو وہ دو عدد افریقی سانپوں پر قابو پا کر فارغ
ہوئے تھے۔
"ہاں! روگان کی حالت اس سانپ کو دیکھ کر عجیب سی ہو
گئی تھی۔ اس نے چلا کر کہا۔ بچو۔ آج تم بچ کر نہیں
جا سکتے۔ یہ کہہ کر وہ سانپ کے پیچھے بھاگا اور جلد اسے
ہاتھ میں لٹکائے آتا نظر آیا۔ اس نے سانپ کے سر
کو مضبوطی سے پکڑ رکھا تھا۔ وہ ایک بھورے رنگ کا چھوٹا
سا سانپ تھا۔
"اس کا ساتھی بھی یہیں کہیں ہوگا اور اس کی گرفتاری کی
خبر اسے جلد ہی ہو جائے گی" روگان نے جلدی جلدی کہا۔
"کیا مطلب۔ کیسے خبر ہو جائے گی"
"گرفتاری کے وقت یہ عجیب سی آواز منہ سے نکالتے

ہیں۔ اگر اس کی مادہ نزدیک ہو گی تو بس آیا ہی چاہتی ہے۔
اور وہ بہت خطرناک انداز میں وار کرے گی — مجھے تو اس سے
کوئی خطرہ نہیں — آپ سب لوگوں کو زبردست خطرہ ہے،
لہٰذا آپ دور ہٹ جائیں۔"

"اور آپ خطرے میں کیوں نہیں ہیں؟" کسی نے اس سے
پوچھا تھا۔

"یہ دیکھ لیں۔" یہ کہہ کر اس نے اپنا دوسرا ہاتھ سانپ
کے منہ کے آگے کر دیا — سانپ نے اس کے ہاتھ پر ڈس
لیا، لیکن اسے کچھ بھی نہ ہوا — اتنے میں ایک اور بالکل
ویسا ہی سانپ پھنکارتا ہوا روگان کی طرف بڑھا اور اس
پر حملہ آور ہوا، لیکن روگان تو تب اس سے ڈرتا نا جب
اسے زہر چڑھنے کا ڈر ہوتا، لہٰذا وہ مادہ سانپ بھی پکڑا گیا۔
روگان نے اسی وقت تنکوں سے ایک ٹوکری بنائی اور ان دونوں
کو اس میں بند کر کے کندھے میں لٹکا لیا، اس نے بعد اس
نے بتایا کہ امریکہ کے چڑیا گھر والے اس جوڑے کے دو لاکھ
ڈالر تک دیں گے۔"

"اوہو اچھا!" کسی نے حیران ہو کر کہا۔

"ہاں! بالکل یہی ہے — ان سانپوں کو تو کوئی پکڑنے کی
بھی جرأت نہیں کرتا — میں، چونکہ سانپوں کا زہر — اور خاص
طور پر اس سانپ کا زہر کھا چکا ہوں، اس لیے اس کے
زہر نے اب مجھ پر کوئی اثر نہیں کیا — ورنہ میرا جسم تو
اس وقت تک پانی بن چکا ہوتا۔"

یہاں تک کہہ کر طالب کامرانی خاموش ہو گئے۔

"بس! آپ صرف یہ واقعہ بتانا چاہتے تھے؟" فرزانہ
نے پوچھا۔

"نہیں — میری بات ابھی ختم نہیں ہوئی — اس سفر کے دوران
ہی ایک دن دونوں سانپ کسی نے چرا لیے۔"

"کیا کہا — سانپ چرا لیے؟" وہ سب ایک ساتھ بولے۔

"ہاں! ٹوکری سمیت — اور پھر لاکھ کوشش کے بعد بھی
سانپ روگان کو نہ مل سکے — وہ بار بار کہتا رہا کہ اس کے
سانپ ہم لوگوں میں سے ہی کسی نے چرائے ہیں — سب
نے جواب میں یہی کہا، اگر ہم میں سے کسی نے چرائے
ہیں تو ہماری تلاشی لے لیں۔

اس نے ذرا لحاظ نہ کیا — تلاشی لے کر رہا — لیکن
کسی کے سامان سے نہ تو سانپ ملے — نہ وہ پٹاری — جو
اس نے ہمارے سامنے بنائی تھی — اور یہ اس سفر کا
حیران کن ترین واقعہ ہے — اور کوئی بات مجھے یاد نہیں۔"
اس نے کہا۔

"یہ بات بھی کم حیران کن نہیں کہ وہ دونوں سانپ سر ابدال خان کی کوٹھی میں پائے گئے ہیں۔"

"کیا کہا۔ کیا وہ انھوں نے چرائے تھے؟" طالب کامرانی نے چلا کر کہا۔

"نہیں۔ میں نے نہیں چرائے تھے۔"

"پھر وہ آپ کے گھر میں کیوں پائے گئے ہیں؟" طالب کامرانی نے پوچھا۔

"وہ میرے میں کسی نے چھوڑ دیے تھے۔ جونہی مجھے وہ نظر آئے۔ میں نے انسپکٹر جمشید کو فون کیا۔ اور پھر انھوں نے کسی نہ کسی طرح ان کو پکڑ لیا۔ اب یہ ان دونوں کو چڑیا گھر کے حوالے کر چکے ہیں۔" سر ابدال خان نے جلدی جلدی کہا۔

"کتنے پیسوں کے بدلے ہیں؟"

"بغیر کسی پیسے کے۔" وہ بولے۔

"حیرت کی باتیں ہیں۔ ذہن ہے کہ الجھتا ہی چلا جا رہا ہے۔" محمود بڑبڑایا۔

"سانپوں والے واقعے کے علاوہ تو کوئی واقعہ پیش نہیں آیا؟"

"نہیں، لیکن میں چونکہ مر رہا ہوں۔ لہذا میں ایک

وہ بات بتانا پسند کروں گا۔ اور وہ بات مجھے ابھی یاد آئی ہے۔ اس سے پہلے خیال تک نہیں گیا۔" ایسے میں طالب کامرانی نے کہا۔

"اوہ۔ جلدی بتائیں۔"

انسپکٹر جمشید بے چین ہو گئے۔ عین اس وقت ایک عجیب بات ہوئی۔۔۔

بات میں وزن

طالب کامرانی کے جسم کو ایک جھٹکا سا لگا اور اس کا جسم ساکت ہو گیا۔ انسپکٹر جمشید اُچھل کر دروازے کی طرف بھاگے محمود، فاروق اور فرزانہ بھی دوڑ پڑے، لیکن جب تک وہ باہر نکلے۔ انسپکٹر جمشید غائب ہو چکے تھے۔

"یہ۔ یہ کیا ہوا؟"

"بے چارے طالب کامرانی کو قتل کر دیا گیا۔ نیلے چاند کی موت سے پہلے" محمود بڑبڑایا

"ن۔ نیلے چاند کی موت" فاروق نے کھوئے کھوئے انداز میں کہا۔ فرزانہ نے بُرا سا منہ بنایا۔

"اس کا مطلب ہے، قاتل باہر موجود تھا۔ اور یہاں ہونے والی باتیں سُن رہا تھا۔ جب اس نے دیکھا کہ طالب کامرانی راز کی بات بتانے لگا ہے تو اس نے اسے قتل کر دیا۔"

"ل۔ لیکن کیسے؟" آئی جی صاحب نے حیرت زدہ انداز میں کہا۔

"ارے ہاں واقعی۔ اس کے جسم پر تو کوئی زخم ہے، نہ کوئی اور چیز۔ آخر یہ قتل کس طرح کیا گیا؟"

"یہ تو پوسٹ مارٹم کی رپورٹ ہی بتائے گی۔" محمود نے کہا۔

"لیکن ہمیں ان کے جسم کا اچھی طرح جائزہ تو لینا چاہیے۔" فرزانہ نے خیال دلایا۔

انھوں نے بغور جائزہ لیا۔ جسم پر نہ کسی زہریلی سوئی کا نشان تھا۔ نہ زخم کا۔ اچانک انھوں نے ایک عجیب منظر دیکھا۔ طالب کامرانی کی لاش کے پاس سے پانی کی ایک لکیر بہتی نظر آئی۔ یہ لکیر لمبی ہی ہوتی چلی گئی۔ اس کے جسم سے پانی رس رہا تھا۔ وہ مارے حیرت اور خوف کے اس منظر کو دیکھتے رہے۔ اور پھر بہنے والے پانی میں تیزی آتی چلی گئی۔ یہاں تک کہ ان کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی اور منہ کھلے کے کھلے رہ گئے۔ ان کے سامنے کپڑے پڑے رہ گئے۔ طالب کامرانی کا سارا جسم پانی بن کر بہ گیا۔

"اُف مالک۔ یہ۔ یہ کیا ہوا؟"

"پتا نہیں۔ کس طرح انھیں ہلاک کیا گیا۔ بے چارے کا جسم تک نہیں بچا۔" آئی جی صاحب نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

"یہ بھی تو ہو سکتا ہے۔ زہر ان کے اپنے پاس موجود ہو۔ کسی کیپسول کی صورت میں۔ اور پھر اس نے

ان الفاظ کے ساتھ ہی کیپسول نگل دیا ہو — یا وہ غیر ارادی
طور پر نگلا گیا ہو۔" فاروق نے خیال ظاہر کیا۔
"انھیں اپنے منہ میں زہر کا کیپسول رکھنے کی کیا ضرورت
تھی بھلا — یہ تو پہلے ہی نیلے چاند کی موت مرنے والے تھے۔"
"میرا خیال ہے — ہمیں انکل اکرام کو بلا لینا چاہیے۔"
"ہاں! تم لوگ اپنا کام شروع کر دو — ہم جا رہے ہیں۔"
آئی جی صاحب نے کہا۔
جلد ہی سب انسپکٹر اکرام وہاں پہنچ گیا — اس کے ماتحتوں
نے اپنا کام شروع کر دیا — اکرام انھیں لے کر کچھ دور
آ کھڑا ہوا:
"یہ کیسے ہوا بھئی؟" اس نے کانپتی آواز میں کہا۔
"دیکھتے ہی دیکھتے — مقتول کی لاش پانی بن کر بہ گئی اور
ہم کچھ بھی نہ کر سکے۔"
"اور انسپکٹر صاحب؟"
"وہ قاتل کے پیچھے گئے تھے — اب تک لوٹ کر
نہیں آئے۔"
"اس کا مطلب ہے — انھوں نے قاتل کو دوڑتے دیکھ
لیا تھا۔"
"یہ تو نہیں کہا جا سکتا — بس جونہی طالب کامرانی کا

جسم ساکت ہوا — انھوں نے باہر چھلانگ لگا دی اور ہم ان کی
گرد کو بھی نہ چھو سکے۔" محمود نے کہا۔
"وہ انکل چھوتے بھی کیسے — بے چاری گرد تو باہر تھی ہی
نہیں۔" فاروق بولا۔
"ایک عدد قتل کی واردات ہو گئی ہے اور یہ حضرت ہیں
کہ مذاق کر رہے ہیں۔" فرزانہ نے جھلا کر کہا۔
"اوہ ہاں — واقعی۔" فاروق نے افسوس زدہ لہجے میں کہا —
وہ یک لخت سنجیدہ ہو گیا۔
"حیرت ہے — ابا جان اب تک نہیں لوٹے — اتنا
لمبا تعاقب۔"
"کہیں وہ الجھ نہ گئے ہوں۔"
"اللہ اپنا رحم فرمائے۔"
"سر — ذرا ادھر آئیے — یہ دیکھیے — کیا ہے؟"
اکرام کے ایک ماتحت کی لرزتی آواز سنائی دی — وہ
اس طرف لپکے اور پھر دھک سے رہ گئے — طالب کامرانی
کے کپڑوں کے نیچے — ایک ننھا سا نیلا چاند پڑا تھا —
"اُف مالک — یہ — یہ چاند تو۔" فاروق کانپ کر رہ گیا۔
"ہاں! یہ چاند تو کیا؟" اکرام بے چین ہو گیا۔
"یہ چاند تو بالکل ایسا ہے — جیسا طالب کامرانی کے

گال میں ابھرا تھا۔"

"... یہ مطلب؟" اکرام چلایا۔

"... یہ کیسے ہو سکتا ہے؟" فرزانہ بولی۔

"کیا ... کیسے ہو سکتا ہے؟" محمود نے کھوئے کھوئے انداز

"نظر تو یہی آتا ہے کہ یہ بالکل وہی چاند ہے جو

کے گال میں تھا، لیکن ہم تو اب تک یہ خیال کرتے

ہیں کہ نیلا چاند ایک نشان ہوتا ہے، لیکن یہاں

چاند موجود ہے۔"

"اور مزے کی بات یہ کہ سارا جسم تو بہ گیا، ہڈیاں

تک تو بہ گئیں — لیکن یہ چاند جوں کا توں موجود ہے۔"

"اس کا مطلب ہے، طالب کامرانی کو جس زہر سے

ہلاک کیا گیا — اس زہر نے اس چاند کا کچھ نہیں بگاڑا

نے جلدی جلدی کہا۔

"اب سوال یہ ہے کہ یہ چاند ہے کس چیز کا؟"

"یہ تو لیبارٹری میں ہی چیک کیا جا سکے گا — اسے

وغیرہ کی مدد سے اٹھا کر محفوظ کر لیا جائے اور فوراً لیبارٹری

بھیج دیا جائے — بلکہ خود ساتھ جاؤ — اور اپنی موجودگی میں اس

کا معائنہ کراؤ۔"

"او کے سر۔" اکرام کے ماتحت ایک ساتھ بولے۔

اور پھر وہ نیلے چاند کو لے کر وہاں سے رخصت ہو گئے۔

گھر والوں کے رونے کی ہلکی ہلکی آوازیں آ رہی تھیں — وہ دلوں پر

شدید بوجھ لیے وہاں سے رخصت ہوئے —

"ابا جان تو ابھی نہیں آئے — ہم لیبارٹری کی رپورٹ

کا انتظار کریں گے — اس کے بعد میدان میں نکلے بغیر نہیں

رہ سکتے، کیونکہ یہ معاملہ تو بہت خوفناک ہوتا جا رہا ہے۔"

"ہوں ٹھیک ہے — میں خود لیبارٹری جاتا ہوں اور جلد از

جلد رپورٹ لانے کی کوشش کرتا ہوں۔" اکرام نے کہا۔

"آپ بہت اچھے انکل ہیں۔" فرزانہ نے خوش ہو کر کہا۔

وہ گھر پہنچے — اندر داخل ہوئے ہی تھے کہ فون کی

گھنٹی سنائی دی — محمود نے آگے بڑھ کر ریسیور اٹھا لیا:

"السلام علیکم!" اس نے کہا۔

"انسپکٹر جمشید کو فون دیں — جلدی۔"

"آپ کون صاحب ہیں؟"

"راجا فیروزی بات کر رہا ہوں — میرے گال پر بھی نیلا

چاند ابھر آیا ہے — خدا کے لیے جلدی آئیں۔" یہ کہ کر دوسری

طرف سے ریسیور رکھ دیا گیا۔

محمود دھک سے رہ گیا — اس نے کانپتے ہاتھ سے ریسیور

رکھ دیا اور بولا:

"یہ لیجیے - ایک اور نیلا چاند۔"

"کیا - کہاں ہے۔" فاروق نے گھبرا کر چاروں طرف دیکھا۔

"دماغ تو نہیں چل گیا - میں نے فون پر بات کی
کر یہ کہا ہے - اور تم گھر میں چاروں طرف دیکھ رہے ہو۔"

"واقعی - یہ تو دماغ چل جانے کی نشانی ہے۔" فرزانہ
نے گھبرا کر کہا -

"تو پھر چھوڑو نیلے چاند کو - پہلے مجھے ہسپتال لے چلو۔"
فاروق نے گھبرا کر کہا -

"یار مذاق چھوڑو۔" محمود نے منہ بنایا -

"حد ہو گئی - جب میں مذاق نہیں کرتا تو بھی کہتے ہو،
مذاق چھوڑو - ارے بھائی - میں اپنا دماغ واقعی خراب
محسوس کر رہا ہوں - اور اگر تم مجھے فوراً ہسپتال نہ لے گئے
تو میں خود چلا جاؤں گا۔"

"میں نے کہا نا - یہ مذاق کا وقت نہیں ہے۔"

"تو میں نے کب کہا ہے کہ یہ مذاق کا وقت ہے۔"
فاروق نے کہا -

"آؤ - راجا فیروزی کے ہاں چلتے ہیں - یہ حضرت انکل
خان رحمان کے دوست ہیں - اور شاید انکل وہاں پہنچ بھی
چکے ہوں گے۔" محمود نے جلدی جلدی کہا -

"وہاں پہنچ گئے ہوتے تو پھر وہ ہمیں فون کرتے - لہٰذا
پہنچے نہیں - ہاں یہ کہا جا سکتا ہے کہ پہنچنے والے ہوں گے۔"
وہ اسی وقت چلنے کے لیے تیار ہو گئے ، یہ دیکھ کر بیگم جمشید
نے بُرا سا منہ بنا کر کہا :

"حد ہو گئی - آنے بھی نہیں تھے کہ جا رہے ہیں۔"

"کیا کیا جائے امی - اور ہاں آپ نے ابا جان کے بارے
میں تو پوچھا ہی نہیں۔"

"پوچھ کر کیا کروں گی - گئے ہوں گے وہ بھی کہیں۔"

"جی ہاں اور ایسے گئے ہیں کہ بہت دیر ہو گئی ، اب
تک لوٹ کر نہیں آئے۔"

"یہ ان کی پرانی عادت ہے اور تم بھی اس عادت کا شکار
ہوتے جا رہے ہو۔"

"کیا کیا جائے ، مجبوری ہے۔" محمود نے کندھے اچکائے۔
بیگم جمشید بُرے بُرے منہ بنا کر رہ گئیں ، وہ باہر نکل
آئے - کر بھی کیا سکتے تھے - راجا فیروزی کے ہاں پہنچے تو
خان رحمان اور پروفیسر داؤد وہاں آ چکے تھے - ان پر نظر پڑتے
ہی خان رحمان بولے :

"بھئی - یہ سب کیا ہو رہا ہے - یہ نیلے چاند کی مصیبت تو
بڑھتی ہی جا رہی ہے - ارے جمشید کہاں ہے ؟"

"جی ہاں ۔ ایک عدد قاتل کے پیچھے گئے تھے ، بہت دیر ہو گئی ، لوٹ کر نہیں آئے ۔"

"ہوں ۔ خیر ۔ آ جائیں گے ۔ یہ ہمارے دوست راجا صاحب بہت پریشان ہیں ۔"

"مشکل یہ ہے کہ افریقہ کی سیر کے دوران کوئی خاص واقعہ ہوا تھا ۔ یہ حضرات اس واقعے کے بارے میں کچھ بتانے کے لیے تیار نہیں ہیں ۔ جس سے بھی پوچھتے ہیں ۔ یہی کہ دیتے ہیں ۔ وہاں کچھ نہیں ہوا ۔"

"خیر ۔ ہم راجا سے بات کرتے ہیں ۔" خان رحمان یہ کہ کر ان کی طرف مڑے ۔ ان کے گال پر نیلا چاند نظر آ رہا تھا ۔

"راجا صاحب افریقہ کی سیر کے دوران اگر کوئی واقعہ پیش آیا تھا تو فوراً بتا دو ۔ اسی میں تمھاری بہتری ہے ۔"

"وہاں ۔ وہاں جو واقعات بھی پیش آئے ۔ ان لوگوں کو بتا ہی دیے گئے ہوں گے ۔ مثلاً رڈگان کا دو عدد سانپ پکڑنا ، پھر ان سانپوں کا چوری ہو جانا ۔ اور رڈگان کا ہمیں ان کانٹوں کے بارے میں بتانا وغیرہ ۔ ان کے علاوہ تو اور کوئی بات نہیں ہوئی ۔"

"پہلے آپ یہ سن لیں کہ ہم کہاں سے آ رہے ہیں اور

یہ دیکھ کر آ رہے ہیں ۔ اس کے بعد غور کیجیے گا کہ آپ ہمیں کیا بتا سکتے ہیں ، لیکن اس سے پہلے ہم حفاظتی انتظامات کریں گے ۔ کہیں طالب کامرانی والا واقعہ یہاں بھی نہ ہو جائے ۔" محمود نے جلدی جلدی کہا ۔

"طالب کامرانی والا واقعہ ۔ انھیں کیا ہوا ہے ؟"

"تو ابھی آپ کو اطلاع نہیں ملی ؟"

"نہیں !!!" کئی آوازیں ابھریں ۔

محمود نے پہلے سادہ لباس والوں کو طلب کیا ۔ ان کی ڈیوٹی کوٹھی کے چاروں طرف لگائی اور انھیں اچھی طرح سمجھا دیا کہ کس طرح نگرانی کرنی ہے ۔ اس کے بعد وہ سب کوٹھی کے ایک اندرونی کمرے میں آ بیٹھے ۔ دروازے اندر سے بند کر لیے گئے ۔ ان تمام انتظامات کو باقی لوگ حیرت زدہ انداز میں دیکھ رہے تھے ۔ آخر خان رحمان سے رہا نہ گیا ، بول اٹھے :

"بات سمجھ میں نہیں آئی ۔ اس قدر زبردست انتظامات کرنے کی آخر کیا ضرورت تھی ؟"

"ضرورت تھی ۔ میں ابھی وضاحت کرتا ہوں ۔"

یہ کہ کر اس نے طالب کامرانی کے ہاں پیش آنے والا تمام واقعہ تفصیل سے سنا دیا :

"یہ — یہ کیسا واقعہ ہے — یقین نہیں آیا۔" پروفیسر داؤد نے لرزتی آواز میں کہا۔

"ہم آنکھوں سے دیکھ چکے ہیں، آپ آئی جی صاحب سے تصدیق کر سکتے ہیں۔"

"خیر — آگے کہو۔"

"اور جب ان کپڑوں کو اٹھایا گیا — جن میں طالب کامرانی کا جسم تھا — جو ہماری آنکھوں کے سامنے جا چکا تھا تو کپڑوں کے نیچے سے ایک نیلا چاند ملا۔"

"کیا کہا — نیلا چاند — کپڑوں کے نیچے سے ملا۔" راجا فیروزی نے کانپتی آواز میں کہا۔

"جی ہاں! وہی چاند جو ان کے گال میں نظر آ رہا تھا۔"

"شاید آپ لوگ مذاق کے موڈ میں ہیں۔" راجا فیروزی نے بُرا سا منہ بنایا۔

"آپ آئی جی صاحب کو فون کر کے تصدیق کر لیں۔" فاروق نے جواب میں ان سے بھی زیادہ بُرا منہ بنایا۔

"کیا آپ حضرات اس واقعے پر یقین کر سکتے ہیں۔" راجا فیروزی خان رحمان اور پروفیسر داؤد کی طرف مڑے۔

"کرنا ہی پڑے گا — ہم انھیں بہت زیادہ اچھی طرح جانتے ہیں۔"

"ہوں — میں اس نیلے چاند کو دیکھنا چاہتا ہوں۔"

"ہم اس کو لیبارٹری بھیج چکے ہیں — واپس ملا تو ضرور دکھائیں گے — کیا میں آپ کے گال کو چھو کر دیکھ سکتا ہوں۔"

"آپ کا مطلب ہے — چاند کی جگہ پر۔" راجا فیروزی نے اسے گھورا۔

"جی ہاں۔" فاروق مسکرایا۔

"ضرور کیوں نہیں۔"

فاروق نے ان کے گال پر اس جگہ اُنگلی پھیری — جس جگہ چاند نظر آ رہا تھا اور پھر اسے زوردار جھٹکا لگا، کیونکہ وُہ جگہ اندر سے سخت تھی اور یُوں محسوس ہو رہا تھا جیسے اندر چاند کے نشان کی جگہ پر کوئی سخت چیز موجود ہو۔

"یہ — یہ — یہ کیا۔" فاروق چلّا اُٹھا۔

"کیا ہوا — کرنٹ تو نہیں لگ گیا اس چاند سے۔" محمود گھبرا گیا۔

"بھئی مذاق نہ کرو — یہ مذاق کا وقت نہیں ہے۔" فرزانہ نے جھلّا کر کہا۔

"یہاں بھی ایک عدد نیلا چاند — واقعی موجود ہے — میرا مطلب ہے — جلد کے نیچے اور ڈاکٹر سے آپریشن کرا کے اس کو نکلوایا جا سکتا ہے۔" فاروق نے تیز آواز میں کہا۔

"اوہ!" وہ سب ساکت رہ گئے۔

اور راجا فیروزی کسی گہری سوچ میں ڈوب گئے، پھر بولے،
"ٹھیک ہے۔ میں آپریشن کراؤں۔ شاید اس طرح میں
بچ جاؤں۔"

"یہ آپ کی مرضی کی بات ہے۔ ویسے افریقہ کے سفر
کے دوران آپ کو کوئی اور واقعہ یاد آیا یا نہیں۔ طالب
کامرانی صاحب کو تو کوئی خاص بات یاد آگئی تھی۔ اور
جونہی وہ بتانے لگے تھے۔ انھیں کسی نے موت کے گھاٹ
اتار دیا۔ اور ایسا اس نے ضرور کسی زہر کے ذریعے کیا۔
کیونکہ جسم کا بہ جانا کسی زہر کے ذریعے تو ہو سکتا ہے اور
شاید کسی طریقے سے نہیں۔ ہم آپ سے پوچھتے ہیں۔ اس
سفر میں کسی ایسے زہر۔ یا کسی ایسے سانپ کا ذکر تو نہیں
آیا تھا؟"

"اوہ ہاں۔ یاد آگیا۔ یاد آگیا۔ یہ خاصیت انھی سانپوں
کے زہر میں ہے۔ اگر وہ کسی کو کاٹ لیں یا ان کا زہر کسی
کے جسم میں داخل کر دیا جائے تو وہ انسان پانی بن کر بہ
جاتا ہے۔"

"اوہ۔ اوہ۔ اب کچھ بات صاف ہو کر سامنے آئی ہے۔
اس جنگل میں ایک تو وہ کانٹے دار پودے ہیں۔ جو اگر جسم

کو چھو بھی جائیں تو گال میں نیلا چاند نظر آنے لگتا ہے
اور اگر ڈاکٹر واک کے تیار کردہ انجکشن نہ لگوائے جائیں تو
موت واقع ہو جاتی ہے۔ لہٰذا مجرم نے ڈاکٹر واک کو ختم
کر دیا۔ تاکہ وہ جو وارداتیں کرنا چاہتا ہے۔ ان کے
راستے میں رکاوٹ نہ پیدا ہو۔ اور دوسری بات یہ کہ ان
جنگلات میں ایسے سانپ پائے جاتے ہیں جو اگر انسان کو کاٹ
لیں تو ان کا جسم پانی بن کر بہ جاتا ہے۔ سوال یہ ہے کہ ان
دو باتوں کے معلوم ہو جانے سے ہم کیا فائدہ اٹھا سکتے ہیں؟"

"اس پر غور کرنا ہو گا۔ آپ فی الحال ڈاکٹر صاحب کو بلا
کر مشورہ کر لیں۔ ابھی آپ کے پاس کچھ وقت ہے۔ اور ہم
غور کرتے ہیں کہ آپ کے لیے کیا کیا جا سکتا ہے۔ ویسے میرے
ذہن میں ابھی ایک الجھن ہے۔" محمود نے پُراسرار انداز میں کہا۔

"اور وہ کیا؟" خان رحمان بولے۔

"یہ کہ۔ طالب کامرانی اگر صرف اتنی بات بتانے والے
تھے کہ وہاں ایسے سانپ پائے جاتے ہیں۔ جو انسان کو پانی
کی طرح بہا دیتے ہیں۔ تو یہ کوئی ایسا راز نہیں۔ جس کی بنا
پر انھیں قتل کر دیا جاتا۔ اس کا مطلب ہے۔ وہ کچھ اور
بتانا چاہتے تھے۔"

"اور وہ بات راجا فیروزی صاحب کے ذہن میں نہیں آ رہی۔"

"نہیں آدمی یا جان بوجھ کر کر رہے ہیں" فرزانہ نے دبی آواز میں کہا۔

"کیا مطلب؟" وہ چونک اٹھے۔

"آؤ۔ ادھر چل کر غور کرتے ہیں۔ یہاں تو بے چارہ غور بھی دھرا کا دھرا رہ جائے گا" فاروق نے برا سا منہ بنایا۔

"کک۔ کون دھرا کا دھرا رہ جائے گا۔" پروفیسر داؤد نے بے خیالی کے عالم میں کہا۔

"جی غور" فاروق مسکرایا۔

"اوہ ہاں غور۔ بھئی اس غور میں بس یہی بات بری ہے۔ جب دیکھو، دھرا کا دھرا رہ جاتا ہے" وہ بولے۔

"یہ۔ یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں" خان رحمان حیران رہ گئے۔

"شش۔ شاید میں کچھ غلط کہہ گیا ہوں" انھوں نے گڑبڑا کر کہا۔

وہ لوگ ہٹ آئے۔

"ہاں فرزانہ۔ کیا کہا تھا تم نے؟"

"یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ راجا فیروزی صاحب کو وہ بات معلوم تو ہو۔ جو مرنے سے پہلے طالب کامرانی کہنا چاہتے تھے۔ لیکن یہ بتائیں گے نہیں"

"کیوں؟" وہ ایک ساتھ بولے۔

"اس لیے کہ اگر یہ مجرم ہیں۔ تو وہ راز کی بات کیوں بتانے لگے۔ جس کو چھپانے کے لیے اپنے ساتھی بمک کو ہلاک کر دیا گیا"

"اوہ۔ محمود اوہ۔ تمھاری بات میں بہت وزن ہے۔ لیکن یہ ضروری نہیں کہ راجا فیروزی ہی مجرم ہو۔ ہو سکتا ہے۔ اسے واقعی وہ بات معلوم نہ ہو جو طالب کامرانی بتانا چاہتے تھے"

"ہاں! یہ ٹھیک ہے"

"مجرم اب تک تین قتل نہایت صفائی سے کر چکا ہے۔ سوال یہ ہے کہ اس کا چوتھا شکار کون ہوگا۔ اگر ہم یہ بات وقت سے پہلے معلوم کر لیں تو مجرم کو بھی رنگے ہاتھوں پکڑ سکتے ہیں"

عین اس وقت کوئی دھم سے گرا۔ وہ اچھل پڑے۔

کارڈ

باہر چھلانگ لگاتے ہی انھوں نے ایک سُرخ رنگ کی کار کو حرکت میں آتے دیکھا تھا۔ بس پھر کیا تھا۔ وہ بجلی کی سی تیزی سے اپنی کار میں سوار ہوتے اور اس کے تعاقب میں نکل گئے۔ طالب کامرانی کے جسم کو جونہی جھٹکا لگا تھا، انھوں نے باہر کی طرف دیکھا تھا اور وہاں کسی کو دوڑتے محسوس کر لیا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ انھوں نے بے تحاشہ دوڑ لگا دی تھی۔ انھوں نے اپنی زندگی میں اس قدر تیز ڈرائیونگ شاید کبھی نہ کی ہوگی۔ آندھی اور طوفان سے بھی تیز چلتے ہوئے آخر وہ کار سے آگے نکل گئے۔ اور پھر سڑک پر اپنی کار ترچھی کر کے روک لی۔ سُرخ کار نزدیک آتے ہی رک گئی:

"خیر تو ہے جناب۔ آپ نے سڑک کس خوشی میں روک لی؟" ایک لڑکی کی آواز سنائی دی۔

انسپکٹر جمشید چونک اُٹھے۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتے تھے

کہ سُرخ کار میں کوئی لڑکی سفر کر رہی ہوگی۔ اب تو انھیں اس پر بھی حیرت ہوئی کہ ایک لڑکی نے اس قدر پھرتی کا مظاہرہ کیا اور طوفانی رفتار سے کار چلائی۔ انھیں یہ سب کچھ عجیب سا لگا۔

"آپ کی تلاشی لینے کے لیے۔" وہ مسکرائے۔

"کس سلسلے میں؟" لڑکی نے ناخوش گوار لہجے میں کہا۔

"میں آپ کا بہت دور سے تعاقب کر رہا ہوں۔ آپ طالب کامرانی کے گھر قتل کی واردات کرنے کے بعد فرار ہوئی ہیں۔"

"ہائیں ہائیں۔ یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں۔ آپ نشے میں تو نہیں ہیں۔"

"میں نے آج تک کسی نشے والی چیز کو ہاتھ تک نہیں لگایا۔" انھوں نے کہا۔

"تب پھر آپ نیند میں ہوں گے۔"

"وہ کیسے۔ کیا آپ تھوڑی دیر پہلے طالب کامرانی کی کوٹھی میں موجود نہیں تھیں؟"

"میں اس نام کے کسی آدمی کو نہیں جانتی۔" اس نے جھلا کر کہا۔

"میں پہلے کار کی تلاشی لوں گا۔ پھر آپ کو پولیس اسٹیشن چلنا ہوگا۔"

"چاہے میں نے کوئی جرم بھی نہ کیا ہو؟"

"پہلے جرم ثابت کروں گا، پھر لے جاؤں گا۔" انسپکٹر جمشید نے اس کے ہاتھوں کو بغور دیکھتے ہوئے کہا۔

"تو پھر شوق سے ثابت کریں۔"

"آپ تھوڑی دیر پہلے طالب کامرانی کی کوٹھی میں موجود نہیں تھیں۔ وہ جس کمرے میں تھے، اس کمرے کے دروازے سے لگ کر نہیں کھڑی تھیں؟"

"نہیں۔ بالکل نہیں۔ میں تو طالب کامرانی کو جانتی تک نہیں۔" اس نے کہا۔

"شکریہ! اگر وہاں آپ کی انگلیوں کے نشانات مل گئے تو؟"

"کیا مطلب؟" وہ چونک اٹھی۔

"جب آپ طالب کامرانی کو نہیں جانتیں اور ان کی کوٹھی میں گئیں بھی نہیں۔ تو پھر آپ کی انگلیوں کے نشانات وہاں نہیں ہو سکتے۔ کیا خیال ہے؟"

"ہاں! نہیں ہو سکتے۔" اس نے کہا۔

"تو پھر پہلے ہم طالب کامرانی کی کوٹھی چلیں گے۔"

"صرف آپ۔ میں نہیں۔" وہ مسکرائی۔

"آپ کیوں نہیں؟"

"ابھی آپ نے مجھ پر جرم ثابت نہیں کیا۔ آپ کس

قانون کے تحت مجھے ساتھ لے جائیں گے۔"

"ہوں! آپ کہہ رہی ہیں۔ خیر آپ مجھے اپنی انگلیوں کے نشانات دے دیں۔"

"اور اگر میں نہ دوں؟"

"تب آپ تفتیش کے راستے میں رکاوٹ ڈالیں گی۔ قتل کے ایک کیس کی تفتیش کے راستے میں۔ اور میں آپ کو اس جرم میں گرفتار کر سکتا ہوں۔"

"آپ زبردستی قتل کا کیس میرے سر تھوپنا چاہتے ہیں۔" اس نے بھنا کر کہا۔

"نہیں! اگر آپ کا اس کیس سے کوئی تعلق نہ ہوا تو میں آپ سے معافی مانگ لوں گا۔" انھوں نے کہا۔

"مجھے آپ کی معافی سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔"

"اب یا تو آپ انگلیوں کے نشانات دیں۔ یا پھر میرے ساتھ پولیس اسٹیشن چلیں۔"

"یہ اچھی زبردستی ہے۔ خیر۔ لے لیجیے انگلیوں کے نشانات۔" اس نے تنگ آ کر کہا۔

انھوں نے ایک سادہ کاغذ پر نشانات لے لیے، پھر بولے:

"اب اپنا شناختی کارڈ دکھا دیں۔ تاکہ میں اس پر سے

آپ کا پتا نوٹ کر لوں؟"

"میں نے آپ جیسا پولیس آفیسر آج تک نہیں دیکھا۔"

"یہ شکایت زندگی میں پہلی بار کی گئی ہے — ورنہ لوگوں کا تو خیال ہے کہ مجھ میں پولیس آفیسروں والی ایک بات بھی نہیں ہے۔" انھوں نے مسکرا کر کہا۔

اس نے کارڈ بھی نکال کر دے دیا — پتا نوٹ کرنے کے بعد وہ بولے:

"آپ ملک سے باہر جانے کی کوشش نہ کیجیے گا، ورنہ آپ کو گرفتار کیا جا سکتا ہے — اور ایک سوال اور — محترمہ آپ اس قدر تیز رفتاری سے جا کہاں رہی تھیں؟"

"آپ کو اس سے کیا؟"

"مجھے اس سے بہت کچھ ہے — ٹریفک کے قوانین کی خلاف ورزی کے جرم میں بھی آپ پر مقدمہ قائم کیا جائے گا۔"

"اوہ اچھا — میں اپنے انکل سے ملنے جا رہی تھی — وہ بیمار ہیں۔"

"انکل کا نام — پتا۔"

"آخر آپ چاہتے کیا ہیں؟"

"آپ کو جھوٹا ثابت کرنا اور پھر قتل کے جرم میں گرفتار کرنا۔" انھوں نے کہا۔

نام اور پتا نوٹ کر لیں — ظفر شان — ۱۳ نیو ٹاؤن۔"

انھوں نے نام اور پتا نوٹ کر لیا — اور اسے جانے کے لیے راستا دے دیا — وہ زوں کر کے آگے چلی گئی — ایک بار پھر انسپکٹر جمشید نے اپنی کار اس کے پیچھے لگا دی اور وائرلیس پر ماتحتوں کو بھی ہدایات دینے لگے۔

ایک گھنٹے تک دونوں کاریں بلا کی رفتار سے دوڑتی رہیں — آخر ایک بار پھر لڑکی نے اپنی کار روک لی، جونہی انسپکٹر جمشید نزدیک آئے — اس نے چیخ کر کہا:

"آخر آپ چاہتے کیا ہیں؟"

"حقیقت جاننا۔" وہ بولے۔

"کیا مطلب؟"

"آپ کا طالب کامرانی قتل سے ضرور تعلق ہے — میں یہ بات ثابت کرنا چاہتا ہوں۔"

"تو کیا تعاقب کر کے ثابت کریں گے؟" اس نے طنزیہ لہجے میں کہا —

"نہیں — میں جب تک یہ نہ دیکھ لوں کہ آپ واقعی اپنے انکل سے ملنے جا رہی ہیں اور وہ بیمار بھی ہیں — اتنے بیمار کہ آپ جلدی پہنچنے کے لیے خطرناک حد تک تیز رفتاری سے کام لے رہی ہیں — اس وقت تک آپ کا تعاقب جاری

دیکھوں گا۔"

"میں نے آپ جیسا پولیس آفیسر ..." وہ کہتے کہتے رک گئی۔

"ہاں ہاں! نہیں دیکھا۔ میں مانتا ہوں، لیکن اس سے
کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ مس نورینو۔"

"میرا نام نورینو نہیں۔ نورین او ہے۔"

"یہ عجیب نام ہے۔ نورین او۔"

"آپ کو اس سے کیا۔ بس میرا یہی نام ہے۔"

"ٹھیک ہے۔ آپ اپنے بیمار انکل کی طرف جانے کی جلدی
نہیں کر رہی اب۔" انھوں نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

"ن۔ نہیں۔ میری طبیعت اچانک خراب ہو گئی ہے۔
میں اب پہلے اپنے گھر جاؤں گی۔ ڈاکٹر سے چیک اپ کراؤں
گی۔ پھر انکل کے پاس جاؤں گی۔"

"کمال ہے۔ کہاں تو اتنی جلدی کر رہی تھیں جانے کے
لیے۔ اور کہاں واپسی کی اچانک ٹھان لی۔"

"میری مرضی۔"

"آپ شاید بوکھلا گئی ہیں۔ اور اس بات سے گھبرا رہی
ہیں کہ آپ کا جھوٹ پکڑا جائے گا۔"

"آپ کچھ بھی کر لیں۔ مجھے کوئی فرق نہیں پڑے گا۔"

یہ کہہ کر اس نے کار موڑ لی۔ اور واپس روانہ ہو

گئی۔ انسپکٹر جمشید مسکرا کر رہ گئے اور پھر اس کے تعاقب میں
چل پڑے۔ یہاں تک کہ دونوں پھر شہر میں داخل ہو
گئے۔ اور پھر لڑکی کو گھر آ گیا۔ وہ ایک شاندار کوٹھی تھی
اور دروازے پر لکھا تھا۔ امیر خان دلاوری۔ سابق گورنر۔

"ہائیں۔ آپ امیر خان دلاوری کی بیٹی ہیں کیا؟"

"کیوں! آپ انھیں جانتے ہیں۔"

"بہت اچھی طرح۔ بلکہ وہ بھی مجھے جانتے ہیں۔ بہت
اچھی طرح۔" انھوں نے کہا۔

"جانتے ہوں گے۔ آپ جا سکتے ہیں۔"

"اب تو میں آپ کے والد صاحب سے مل کر ہی جاؤں
گا۔" انھوں نے کہا۔

"انسپکٹر جمشید آپ آگ سے کھیل رہے ہیں۔" اچانک اس کی
آواز حد درجے سرد ہو گئی۔ چہرہ آگ کی طرح سرخ ہو گیا،
آنکھوں سے شعلے نکلتے نظر آئے۔

"اوہو۔ محترمہ آپ میرا نام بھی جانتی ہیں۔"

"ہاں کیوں نہیں۔ بہت اچھی طرح جانتی ہوں اور پہچانتی
ہوں۔ اس معاملے کو یہیں ختم کر دیں۔ اس میں آپ کی بہتری
ہے، ورنہ بہت لمبے الجھ جائیں گے۔"

"لمبا میں نہیں، آپ الجھ گئی ہیں محترمہ۔ ابھی آپ کو

اندازہ نہیں ہے۔"

"اچھی بات ہے — بہت جلد اندازہ ہو جائے گا — کہ کون اُلجھا ہے۔"

یہ کہہ کر اس نے گھنٹی کا بٹن دبا دیا — ایک باوردی ملازم نے دروازہ کھولا:

"اوہو — بے بی صاحبہ آگئیں۔"

"ڈیڈی سے کہو — ان سے انسپکٹر جمشید ملنا چاہتے ہیں۔"

"وہ بہت مصروف ہیں — کئی بڑے آفیسر آئے ہوئے ان سے ملنے۔"

"سن لیا آپ نے۔" نوین او نے ان کی طرف مڑ کر کہا۔

"میرا کارڈ ان تک پہنچا دیا جائے — اگر انھوں نے ملاقات کا وقت نہ دیا تو میں زبردستی اندر داخل ہو جاؤں گا۔" انھوں نے کہا۔

"کیا کہا — زبردستی — نہیں جناب — آپ ایسا نہیں کر سکیں گے — کوٹھی کے چاروں طرف مسلح پہرے دار موجود ہیں۔" اس نے کہا۔

"کوئی بات نہیں — اگر کارڈ اندر جانے کے پانچ منٹ بعد تک مجھے نہ بلایا گیا — یا جواب نہ ملا تو اندر آ جاؤں گا۔" انسپکٹر جمشید نے سرد آواز میں کہا۔

ملازم نے گھبرا کر ان کی طرف دیکھا اور کانپ گیا — تھوڑی دیر پہلے انھیں ایک بہت سیدھا سادا شریف صورت انسان دکھائی دیا تھا — اب وہی آدمی حد درجے خونخوار نظر آ رہا تھا — وہ جلدی سے اندر چلا گیا — نوین او اس سے پہلے جا چکی تھی —

دو منٹ بعد ہی ملازم واپس آ گیا۔ اس نے کہا۔

"چلیے — صاحب آپ کو بلا رہے ہیں۔"

"لیکن ان کے پاس تو سرکاری آفیسر بیٹھے تھے۔"

"انھیں ایک طرف کر دیا گیا ہے — آپ آئیے۔" اب اس کے لہجے میں بہت ادب تھا۔

وہ اس کے پیچھے چلتے ہوئے ایک شان دار کمرے میں داخل ہوئے — انھوں نے دیکھا — تخت نما ایک مسہری میں بھاری بھر کم امیر خان دھنسے ہوئے تھے — انھوں نے اپنے آدھے دھڑ تک کمبل اوڑھا ہوا تھا — ان کے سرہانے نوین او بھی کہنی کے سہارے نیم دراز تھی۔ وہ انھیں دیکھ کر طنزیہ انداز میں مسکرائی:

"یہ ہیں وہ حضرت ڈیڈ — جن کی وجہ سے مجھے بہت پریشانی ہوئی ہے۔"

"آئیے انسپکٹر صاحب — تشریف رکھیے۔" امیر خان نے

جیسے بیٹی کا تحفظ منشا ہی نہیں۔

"بس فوراً ادھر— پھر ایک قتل کا شبہ کیا جا رہا ہے سر، ان سے کہیے، تفتیش کے راستے میں روڑے نہ اٹکائیں۔"

"میری بیٹی نے کوئی جرم نہیں کیا— آپ اسے تفتیش سے خارج کر دیں— یہ میری آپ سے درخواست ہے۔"

"سر! قتل بھی کسی چھوٹے آدمی کا نہیں ہوا ہے— آپ نے طالب کامرانی کا نام تو سنا ہوگا۔"

"ہاں سنا ہے— ارے کیا انھیں قتل کر دیا گیا ہے؟"

"ہاں جناب— اور جب وہ قتل کیے گئے— ان کے کمرے کے دروازے پر آپ کی بیٹی موجود تھیں، یہ اسی وقت وہاں سے بھاگ کھڑی ہوئیں— میں نے تعاقب کیا تو انھوں نے کار اس قدر تیز چلائی کہ کیا بتاؤں— میں بھی بہت مشکل سے انھیں پکڑ سکا— کوئی اور تعاقب میں ہوتا تو یہ نکل گئی تھیں۔"

"بلکہ مجھے تو حیرت ہے— آپ نے انھیں پکڑ کس طرح لیا— اس نے تو کاروں کی دوڑ میں بے شمار انعامات جیتے ہیں— یورپ کے ماہرین بھی اس سے نہیں جیت سکے۔"

"اوہو اچھا— میں بھی حیران تھا— یہ ہیں کیا چیز— کہ اس قدر تیز کار چلا رہی ہیں۔" انسپکٹر جمشید بولے۔

"لیکن یہ آپ کی وجہ سے اس قدر تیز کار نہیں چلا رہی تھی— یہ تو اس کی عادت ہے۔"

"لیکن آج انھوں نے عادت کا حوالہ نہیں دیا— بلکہ یہ کہا تھا کہ ان کے انکل ظفر شان بیمار ہیں— لہٰذا یہ ان سے ملنے کی جلدی میں اس قدر تیز کار چلا رہی ہیں۔"

امیر خان دلاوری نے تیز نظروں سے اپنی بیٹی کی طرف دیکھا، پھر جلدی سے ان کی طرف مڑے:

"خیر یہی بات ٹھیک ہے— ان کی بیماری کی خبر ملی تھی، لیکن یہ مجھے بتائے بغیر ہی چلی گئی— اب آپ جا سکتے ہیں۔"

"جی کیا فرمایا— میں جا سکتا ہوں۔"

"ہاں اور کیا۔"

"میں نے آپ کو بتایا ہے کہ معاملہ ایک قتل کیس کا ہے۔"

"ارے تو کیا میری بیٹی نے یہ قتل کیا ہے۔"

"جی— اس بات کے نوے فی صد امکانات ہیں۔"

"ثبوت پیش کریں انسپکٹر— ثبوت کے بغیر کون آپ کی بات سنے گا۔"

"پہلا ثبوت تو یہ ہے سر— کہ ان کے انکل بالکل بھی بیمار نہیں ہیں— میں نے تصدیق کر لی ہے۔"

"بالکل جھوٹ ڈیڈ — جب سے یہ میرے پیچھے لگے ہیں — یہ کہیں اور نہیں گئے" نورین او نے فوراً کہا۔

"تو میں نے کب کہا ہے — کہ میں کہیں گیا ہوں"

"تو پھر آپ نے کیسے کہہ دیا کہ ان کے انکل بیمار نہیں ہیں" امیر خان دلاوری بولے۔

"اس طرح کہ میں نے گاڑی میں رکھے وائرلیس سیٹ پر ریڈیو اسٹیشن میں اپنے ماتحتوں کو ہدایات دی تھیں — انھوں نے فوری طور پر مسٹر ظفر شان سے ملاقات کی تو معلوم ہوا کہ وہ ذرا بھی بیمار نہیں ہیں — آخر مس نورین او کو جھوٹ بولنے کی کیا ضرورت تھی — نہ صرف انھیں — بلکہ آپ کو بھی"

"ہمیں یہی اطلاع ملی تھی — شاید کسی نے غلط اطلاع دے دی — یا پھر کسی نے مذاق کیا ہو گا — یہ بھی ہو سکتا ہے، ظفر شان نے ہی یہ مذاق کیا ہو، جب اس کا جی نورین سے ملنے کو چاہتا ہے تو وہ ایسی اطلاع کر دیتا ہے اور نورین بھاگ کھڑی ہوتی ہے"

"آپ بھی جھوٹ میں اپنی بیٹی کا ساتھ دے رہے ہیں"

"انسپکٹر — ہوش میں رہ کر بات کریں — نہ میں جھوٹ بول رہا ہوں، نہ میری بیٹی" امیر خان دلاوری غرائے۔

"بقول آپ کے — یہ اپنے انکل سے ملنے جا رہی تھیں، تو یہ گھر سے سیدھی وہاں جا رہی ہوں گی نا"۔

"ہاں بالکل"

"تو پھر ان کی انگلیوں کے نشانات طالب کامرانی کی کوٹھی سے نہیں ملنے چاہییں"

"ہاں! نہیں ملنے چاہییں" اس نے کہا۔

"اور اگر مل گئے تو آپ کی بیٹی بالکل جھوٹی ثابت ہو جائے گی"

"تو پھر جائیے — پہلے انگلیوں کے نشانات حاصل کیجیے"

"شکریہ! میں جا رہا ہوں — بہت جلد لوٹوں گا — آپ کو وارننگ ہے — آپ ملک چھوڑ کر جانے کی کوشش نہیں کریں گے" انسپکٹر جمشید نے کہا۔

"میں اور میری بیٹی اگر ملک سے باہر جانا چاہیں تو ہمیں کون روک سکتا ہے"

"میں روکوں گا" انھوں نے کہا۔

"دیکھا جائے گا — فی الحال تو ہمیں فرار ہونے کی ضرورت ہی نہیں" امیر خان دلاوری نے غرا کر کہا۔

وہ جانے کے لیے مڑ گئے — طالب کامرانی کے ہاں اکرام اور اس کے ماتحت اپنا کام مکمل کر چکے تھے، لیکن ان کے

انتظار میں وہیں ٹھہرے ہوئے تھے — اس کیس کی لاش تو
تھی ہی نہیں کہ پوسٹ مارٹم کے لیے ہسپتال بھجوائی جاتی —

"طالب کامرانی کے دروازے پر قاتل کی انگلیوں کے نشانات
ملے ہوں گے؟"

"جی ہاں! موجود ہیں — اُٹھائے جا چکے ہیں۔"

"مجھے دکھاؤ۔" وہ بولے۔

انھوں نے نشانات آپس میں ملائے اور پھر اُچھل کر
کھڑے ہو گئے:

"امیر خان دلاوری کی بیٹی ہی قاتل ہے — آؤ اکرام —
جلدی کرو۔"

وہ اسی وقت اکرام کے ساتھ روانہ ہو گئے اور بلا کی
رفتار سے کار چلاتے اس کی کوٹھی تک پہنچے — دستک دی
گئی — اندر سے ملازم باہر نکلا:

"صاحب تو بٹیا سمیت کہیں گئے ہیں۔"

"کہاں؟" وہ بولے۔

"جی — بتا کر نہیں گئے۔"

"اوہ!" ان کے منہ سے نکلا۔

انھوں نے فوراً وائرلیس پر اپنے ماتحتوں سے رپورٹ طلب
کی — فوراً ہی انھیں بتایا گیا:

"دونوں کا تعاقب کیا جا رہا ہے۔"

"بہت خوب! انھیں روکنے کی کوشش نہ کی جائے — جہاں
جاتے ہیں، بس تعاقب جاری رکھا جائے — میں بھی آ رہا
ہوں۔" انھوں نے پُرجوش انداز میں کہا اور پھر اس سمت میں
روانہ ہو گئے — جس سمت کا اشارہ انھیں دیا گیا تھا۔

جلد ہی انھیں احساس ہو گیا کہ ان کا رُخ سمندر کی
طرف ہے:

"حیرت ہے — کیا باپ بیٹی سمندر کے راستے فرار ہونے
کا پروگرام رکھتے ہیں؟"

"اس کے سوا کیا کہا جا سکتا ہے سر — اوہ!"

"یہ بعد میں اوہ کس خوشی میں؟" انسپکٹر جمشید مسکرائے۔

"میں نے ایک بار سُنا تھا — امیر خان دلاوری نے اپنی
گورنری کے زمانے میں ایک بہت بڑی لانچ خریدی تھی۔"

"تمھارا مطلب ہے — وہ اس وقت اس لانچ کے ذریعے
ہی فرار ہونے والا ہے۔"

"اس کے سوا کیا کہا جا سکتا ہے سر۔"

"تو کوئی بات نہیں — ہم اس کا تعاقب کریں گے — ذرا
دیکھیں تو — وہ جاتے کہاں ہیں۔"

"تو پھر میں سمندر میں اپنے ساتھیوں کو ہوشیار کر دوں۔"

"ہاں! ہمیں بھی لانچ تیار ملنی چاہیے۔"

"مشکل یہ ہے کہ ابھی ہمیں یہ معلوم نہیں۔ یہ دونوں کون سے ساحل سے روانہ ہوں گے۔"

"کوئی پروا نہیں۔ لانچ تیار رہے بس۔"

تعاقب جاری رہا۔ آخر وہ سمندر کے کنارے پہنچ گئے۔ وہاں ان کے ماتحتوں نے بتایا کہ امیر خان دلاوری کی لانچ جا چکی ہے۔ اور اس سمت میں گئی ہے۔ انھیں سمت بھی بتائی گئی۔ وہ اپنی لانچ میں روانہ ہو گئے۔

انسپکٹر جمشید لانچ چلانے میں کافی ماہر تھے۔ اور ان کا اندازہ تھا کہ جلد ہی وہ امیر خان کی لانچ کو دیکھ لیں گے۔ لیکن ان کا یہ اندازہ غلط ثابت ہو گیا۔ وہ لانچ انھیں کافی دیر تک بھی نظر نہ آ سکی۔

"اس کا مطلب ہے سر۔ ان کی لانچ کی رفتار ہماری لانچ سے بہت زیادہ ہے۔"

"ہاں! وہ کوئی خاص لانچ ہے۔" انسپکٹر جمشید بڑبڑائے۔

"لانچ تو ہماری بھی خاص ہے۔"

"ہاں! لیکن شاید ان کی نسبت کم۔ اگر ہمیں معلوم ہوتا کہ وہ فرار ہونے کی کوشش کریں گے اور سمندر تک یہ معاملہ پیش آئے گا تو ہم بھی بہت خاص لانچ کا انتظام کر لیتے۔"

"پھر۔ اب کیا کیا جائے؟"

"تعاقب جاری رہے گا۔۔ وہ جائیں گے کہاں۔"

"سر۔ ہماری اطلاعات کے مطابق۔ اس طرف ایک بہت بڑا جزیرہ ہے۔ اس جزیرے پر باقاعدہ ایک حکومت ہے۔ جس نے ایک علیحدہ ریاست کی حیثیت اختیار کر رکھی ہے۔ ایک آزاد ریاست۔ یہ ریاست ایک چھوٹے ملک کے برابر تو ضرور ہے۔"

"کیا تم یہ کہنا چاہتے ہو کہ وہ دونوں اس ریاست میں چلے گئے ہیں۔"

"اس کے سوا میں کہ بھی کیا سکتا ہوں۔"

"تو پھر چلو۔ ریاست کی سیر ہم بھی کر لیں۔" انسپکٹر جمشید مسکرائے۔

ان کا سفر جاری رہا، یہاں تک کہ ریاست کے آثار نظر آنے لگے۔ جونہی ان کی لانچ کنارے پر لگی۔ بے شمار رائفلوں کے دہانے ان کی طرف ہو گئے۔

"خبردار۔ آپ لوگ ہاتھ اوپر اٹھا دیں۔ ورنہ آپ کو لانچ سمیت اڑا دیا جائے گا۔"

"لو بھئی۔ یہاں تو اڑانے کی باتیں ہونے لگیں۔"

"ہاتھ تو اب اٹھانے ہی پڑیں گے سر۔" اکرام نے منہ بنایا اور دونوں نے ہاتھ اٹھا دیے۔

"لانچ میں کوئی اور تو نہیں ہے؟"

"نہیں۔" انسپکٹر جمشید بولے۔

"اس طرف کیوں آئے ہو؟"

"ہمارے ملک کے دو مجرم اس طرف آئے ہیں۔ ہم ان کے تعاقب میں یہاں پہنچے ہیں۔ ہمارے کارڈ ملاحظہ ہوں۔" یہ کہہ کر انسپکٹر جمشید نے کارڈ ان کی طرف بڑھا دیے۔

"آپ کو ریاست میں داخل ہونے کے لیے باقاعدہ اجازت نامہ حاصل کرنا پڑے گا۔ اس وقت تک آپ کو نگرانی میں رکھا جائے گا۔"

"اس طرح تو مجرم ریاست سے غائب ہو جائیں گے۔"

"اگر ان کے پاس پہلے سے اجازت نامہ تھا تو وہ اس وقت کہیں کے کہیں پہنچ چکے ہوں گے۔"

"تھوڑی دیر پہلے اسی سمت سے کوئی لانچ یہاں نہیں پہنچی؟"

"نہیں۔ اس طرف تو نہیں آئی۔ ہو سکتا ہے۔ کسی دوسرے ساحل سے یہ لوگ اترے ہوں۔"

"خیر۔ ہم باقاعدہ اجازت لیں گے۔"

"آپ کو اس کمرے میں جانا ہوگا۔ وہاں متعلق عملہ موجود ہے۔"

مسلح پہرے داروں کی نگرانی میں انہیں اس کمرے تک

پہنچایا گیا۔ ان کے پستول بھی لے لیے گئے تھے۔ کمرے میں واقعی باقاعدہ عملہ موجود تھا۔ ان کے کاغذات چیک کیے گئے، کارڈ وغیرہ دیکھے گئے۔ دو گھنٹے کی کارروائی کے بعد انہیں ایک اور آفیسر کے سامنے پیش کیا گیا۔

"کیا یہ ریاست ہمارے ملک کی دوست ریاست نہیں ہے اکرام؟" انسپکٹر جمشید نے جھلائے ہوئے انداز میں پوچھا۔

"یس سر۔ واجبی سے تعلقات ہیں۔"

"اوہ اچھا۔ لیکن شاید امیر خان دلاوری کے تعلقات اس ریاست سے اچھے ہیں، کیونکہ نہ وہ خود نظر آئے، نہ ان کی لانچ۔"

"ہو سکتا ہے سر۔ یہی بات ہو۔"

"آئیے جناب اس طرف۔" ایک نگران نے ایک کمرے کے دروازے کی طرف اشارہ کیا۔

دونوں اندر داخل ہو گئے۔ باہر سے دروازہ بند کر دیا گیا۔ دونوں نے چونک کر دیکھا۔ اندر شاہانہ انداز تھا۔ ریاست کا حاکم ایک تخت پر پُر غرور انداز میں بیٹھا تھا۔ اس کے دائیں بائیں بہت سے مسلح پہرے دار کھڑے تھے، ان کے ہاتھوں میں جدید رائفلیں تھیں، لیکن انہیں زیادہ حیرت یہ دیکھ کر ہوئی کہ ریاست کا حاکم ان کے لیے اجنبی نہیں تھا، وہ ایک بہت مشہور و معروف سمگلر تھا۔ ایک بین الاقوامی سمگلر۔

یہ اور بات ہے کہ وہ میک اپ میں تھا اور میک اپ کے
باوجود انھوں نے اسے پہچان لیا تھا، تاہم وہ انجان بنے کھڑے
رہے — آخر اس نے کہا:

"ان لوگوں کو ہمارے سامنے کیوں پیش کیا گیا ہے؟"

"یہ ریاست کی سیر کرنا چاہتے ہیں سر۔"

"قانون اگر اجازت دیتا ہے تو انھیں سیر کی اجازت دے دو۔"

"قانون اجازت نہیں دیتا سر — یہ آپ کے دوست امیر
خان دلاوری اور ان کی بیٹی کی تلاش میں یہاں آئے ہیں — آپ
کے دوست ہمیں یہ بات پہلے ہی اچھی طرح بتا چکے ہیں۔"

"اوہ — اچھا — ٹھہرو۔"

یہ کہہ کر اس نے زور سے تالی بجائی — دوسرا لمحہ چونکا
دینے والا تھا۔

انجکشن

انھوں نے دیکھا، وہ سر سے پیر تک سیاہ لباس میں
ڈوبا ہوا تھا — اس کے ہاتھ میں ایک بالکل نئی طرز کی رائفل
تھی — فوراً ہی اس نے کہا:

"خبردار! کوئی حرکت نہ کرے — اس رائفل سے ایک
وقت میں سو فائر کیے جا سکتے ہیں — لگاتار فائر — تم میرے
آنے کا انداز دیکھ ہی چکے ہو — میں اسی طرح واپس بھی
چلا جاؤں گا اور تم منہ دیکھتے رہ جاؤ گے — مجھے اس گھر
میں اور کسی سے کوئی غرض نہیں — بس — راجا فیروزی کی
جان لینا چاہتا ہوں — لہٰذا اگر تم لوگوں نے میرے راستے
میں کوئی رکاوٹ نہ ڈالی تو میں اپنا کام کر کے نہایت اطمینان
سے لوٹ جاؤں گا — اور اگر کوئی گڑبڑ کرنے کی کوشش کی
تو پھر میں سب کو بھون کر رکھ دوں گا۔"

"لیکن مشکل یہ ہے کہ راجا فیروزی اندرونی کمرے میں

لگا۔ یہ آواز ان تک پہنچ چکی ہے۔ اور انھوں نے
اب تک کمرے کا دروازہ اندر سے بند کر لیا ہو گا۔"
فاروق نے منہ بنا کر کہا۔
"تم سے بات کرنے کو کس نے کہا:" نقاب پوش غرایا۔
"میرے جی نے:" فاروق فوراً بولا۔
"خاموش! ورنہ تم لوگ بھی موت کے گھاٹ اتر جاؤ گے۔"
"آخر آپ راجا فیروزی کو کیوں قتل کرنا چاہتے ہیں۔
اور پھر اس کیس میں تو قتل کرنے کے لیے نیلے چاند سے کام
لیا جا رہا ہے۔ یہ ڈالفل پروگرام کہاں سے نکل آیا:"
"تمھاری زبان ہے کیا۔ ذرا خاموش نہیں رہ سکتی۔
نیلے چاند سے قتل کرنے میں تین دن لگتے ہیں، لیکن حالات
نے پلٹا کھایا ہے۔ اس لیے یہ کام اب جلد از جلد مکمل
کرنا ہے:"
"تو کیا افریقہ کی سیر کے لیے جانے والے تمام لوگوں
کو ختم کیا جائے گا:" فرزانہ نے چونک کر کہا۔
نقاب پوش نے بھی چونک کر اس کی طرف دیکھا:
"بہت تیز ہو۔ لیکن آج تم لوگوں کی تیزی کام نہیں
آئے گی:"
"کیوں، آج ہماری تیزی کو کیا ہو جائے گا؟"

"تیزی تمام ہو جائے گی:"
"وہ ترکی ہے جو تمام ہوا کرتی ہے۔ سمجھے مسٹر۔ تم
ہماری موجودگی میں راجا فیروزی کو ہاتھ بھی نہیں لگا سکتے:"
"ہاتھ لگانے کی مجھے ضرورت بھی کیا ہے۔ میرے پاس
تو یہ ہے:" اس نے اپنی ڈالفل کو حرکت دی۔
"اور ادھر دیکھو۔ ہمارے پاس کیا کچھ ہے:" یہ کہہ کر
فرزانہ نے اپنا کلپ بالوں سے اتار کر اسے دکھایا۔
وہ ہنس پڑا:
"یہ تو صرف بالوں کا ایک کلپ ہے:"
"اچھا تو پھر ادھر دیکھو:" فاروق نے جیب میں ہاتھ ڈالا
اور جب اس کا ہاتھ باہر نکلا تو اس میں ایک پنسل تراش
تھا۔
"کمال ہے فاروق، آج اس قدر جلد پنسل تراش کس
طرح مل گیا تمھیں؟"
"جب جلدی ہوتی ہے تو میں چیزیں جلد تلاش کر لیتا
ہوں:" اس نے کہا۔
"یہ صرف ایک پنسل تراش ہے:" اس نے پھر ہنس
کر کہا۔
"اوہو۔ اچھا تو پھر یہ لو:" محمود نے کہا اور جیب سے

سگریٹ نکال کر منہ میں لے لیا۔

"بری بات ہے — تم اس عمر میں سگریٹ پینے لگ گئے؟"

"جب تم جیسے اس عمر میں جدید رائفلیں چلاتے پھرتے ہیں تو ہم کیا سگریٹ بھی نہ چلائیں؟"

"چلائیں یا پئیں؟"

"ہماری طرف سگریٹ چلانے کے کام آتے ہیں، کیوں فاروق؟"

"مجھ سے پوچھنے کی بجائے تم بھائی صاحب کو چلا کر کیوں نہیں دکھا دیتے؟"

"ابھی وقت نہیں آیا۔"

"کیا مطلب — یہ تم نے کیا سگریٹ چلانے کی لگا رکھی ہے؟"

وہ پہلی مرتبہ چونکا۔

"ہم ہیں بس یہی بات بری ہے — جب دیکھو — کچھ نہ کچھ چلانے لگتے ہیں۔" فاروق مسکرایا۔

"ارے! کہیں تم لوگ انسپکٹر جمشید کے بچے تو نہیں ہو؟" اس نے چلا کر کہا۔

"دھت تیرے کی — پہچان لیا نا آخر — پتا نہیں لوگوں کو کیا ہو گیا ہے — جسے دیکھو — پہچان رہا ہے بس — جیسے کرنے کے لیے اور کوئی کام ہی نہ ہو۔"

"اگر تم انسپکٹر جمشید کے بچے ہو تو پھر تم ہرگز کوئی حرکت نہیں کرو گے — اب تم اپنے ہاتھ جیبوں کی طرف بھی نہیں لے جا سکتے — ہاں!"

"اب کیا کریں گے لے جا کر۔" محمود بولا۔

"اور ہاں! اپنے یہ کھلونے گرا دو نیچے۔"

"کیوں! کیا اب ان سے خطرہ محسوس ہونے لگا؟"

"ہاں! پہلے مجھے معلوم نہیں تھا — میں تمہیں عام لڑکے سمجھا تھا۔"

"تو ہم نے کب کہا کہ ہم خاص لڑکے ہیں؟"

"تم نے ابھی یہ چیزیں نیچے نہیں گرائیں؟"

"یہ لو مسٹر — اگر تم نہ کہتے تو ہم ابھی یہ چیزیں نہ گراتے۔" فاروق نے کہا اور اپنا پنسل تراش اس کے پیروں میں دے مارا — وہ ایک دھماکے سے پھٹا، نقاب پوش کے منہ سے چیخ نکل گئی — وہ منہ کے بل نیچے گرا، اس کی رائفل فرش پر پھسلتی ہوئی دور جا گری —

"بہت خوب! اسے کہتے ہیں ہینگ لگے نہ پھٹکڑی، رنگ چوکھا آئے۔" فرزانہ مسکرائی۔

"اور مسٹر تم ناچ تو جانتے نہیں — چلے آئے ہیں ہمارے آنگن کو ٹیڑھا بتانے۔" فاروق نے منہ بنایا۔

"یہ کیا بات ہوئی؟" فرزانہ نے اسے گھورا۔

"ان جیسوں کے لیے کوئی بات ہونا ضروری نہیں۔" محمود نے منہ بنایا۔

انھوں نے جلدی جلدی اسے باندھ لیا۔ ہوش میں آتے ہی اس نے اٹھنے کی کوشش کی، لیکن کسمسا کر رہ گیا۔

"مسٹر ابھی تک ہم نے آپ کا منہ نہیں دیکھا۔ آپ کی اجازت کے بغیر دیکھنا ہم نے پسند بھی نہیں کیا۔ کیا خبر آپ کوئی پردہ نشین خاتون ہی ہوں۔ ویسے ہم نے اپنے انکل اکرام کو فون کیا تھا۔ وہ تو خیر ملے نہیں، ان کے ماتحت آتے ہی ہوں گے۔ وہ آپ کو سرکاری مہمان خانے میں لے جائیں گے۔ بہت اچھی جگہ ہے، اچھے اچھوں کا دماغ درست کر دیتی ہے۔ ارے ہاں۔ میں باتیں کیے جا رہا ہوں۔ اور آپ کو کچھ کہنے کا موقع تک نہیں دے رہا۔ یہ نا بد تمیزی۔ ہاں، تو آپ کچھ کہنا چاہتے ہیں تو شوق سے کہ لیں۔"

"مجھے کچھ نہیں کہنا۔ تم لوگ مجھے زیادہ دیر تک جیل میں نہیں رکھ سکو گے۔"

"تو کیا تمھارا جیل جاتے ہی خودکشی کر لینے کا ارادہ ہے، اطلاعاً عرض کر دیں کہ اگر تم مسلمان ہو تو مسلمان کے لیے خودکشی

حرام موت ہے۔ اور خودکشی کرنے والا بخشا نہیں جاتا۔"

"میرا ایسا کوئی ارادہ نہیں۔ میرے وارث مجھے چھڑا لیں گے آ کر۔"

"اوہ اچھا تو یہ بات ہے۔ خیر بھئی۔ جب وہ آئیں گے تو انھیں بھی دیکھ لیں گے۔"

اسی وقت حوالدار محمد حسین آزاد اپنے ماتحتوں کے ساتھ وہاں پہنچ گیا:

"چلو بھئی۔ پہلے تو اس حالت میں اس کی تصاویر لو۔ پھر ہم اس کی نقاب کشائی کریں گے۔" فاروق نے جلدی جلدی کہا۔

"کیا کہا۔ نقاب کشائی کریں گے۔ ارے میاں نقاب کشائی تو کسی عمارت وغیرہ کے افتتاح کے موقعے پر کی جاتی ہے، پردہ ہٹا کر۔"

"تو کیا ہوا۔ آج ہم اس کے چہرے سے پردہ ہٹا کر نقاب کشائی کر لیں گے، آخر ہمارا جاتا کیا ہے۔"

"ہاں ٹھیک تو ہے۔ جانے کو اس دنیا میں کیا جاتا ہے۔" فرزانہ نے فوراً کہا۔

"لو اور سنو۔ اپنے ہی تکیہ کلام کا بیڑہ غرق کر دیا۔"

محمد حسین آزاد کے آدمی جب اس کی تصاویر لے چکے تو اس نے آگے بڑھ کر اس کے چہرے سے نقاب نوچ لیا۔

لیکن یہ دیکھ کر انھیں مایوسی ہوئی کہ وہ چہرہ دیکھا بھالا نہیں تھا۔

"یہ تو کوئی مزے دار بات نہیں ہوئی۔"

"تم تو ہر بات میں مزے دار بات تلاش کرنے لگ جاتے ہو۔ آخر اتنی مزے دار باتیں آئیں کہاں سے۔" فرزانہ نے جل بھن کر کہا۔

"کیا نام ہے تمھارا؟" محمد حسین آزاد نے غراتے ہوئے لہجے میں کہا۔

"میرا نام ہے نمبر تیرہ۔"

"ارے بھائی۔ ابھی وہ زمانہ نہیں آیا۔ جب لوگوں کے ناموں کی بجائے ان کے نمبر رکھے جایا کریں گے۔"

"میرا نام یہی ہے۔ نمبر تیرہ۔"

"اچھا تو بھائی نمبر تیرہ۔ آپ کہاں رہتے ہیں؟"

"میرا کوئی گھر نہیں ہے۔ بچپن میں ماں باپ فوت ہو گئے تھے۔ آوارہ پھرتے ہوئے جوان ہوا اور پھر ایک نامعلوم آدمی کے ہاتھ لگ گیا۔ اس وقت سے آج تک اسی کے لیے کام کرتا ہوں۔ وہ مجھے کھانے پینے اور پہننے کی کوئی تکلیف نہیں ہونے دیتا۔ جیب خرچ بھی خوب ملتا ہے۔ اسی نے میرا نام نمبر تیرہ رکھا ہے۔"

"اچھا چلو۔ تم اپنے بارے میں کچھ نہیں جانتے تو اس کے بارے میں بتاؤ۔ جس کے لیے کام کرتے ہو؟"

"افسوس! اس کے بارے میں میں تو کیا۔ کوئی بھی نہیں جانتا۔" اس نے سرد آہ بھری۔

"یہ کیا بات ہوئی۔"

"اس کے لیے کام کرنے والے بہت سے ہیں، لیکن وہ سب اسے ہرگز نہیں جانتے۔ وہ آج تک ہم میں سے کسی کے سامنے نہیں آیا۔"

"وحشت تیرے کی۔ یہ تو پھر وہی۔ نامعلوم باس والا معاملہ نکل آیا۔" محمود نے جھلا کر اپنی ران پر ہاتھ مارا۔

"ہماری قسمت ہی میں یہ ہے۔" فاروق نے منہ بنایا۔

"اور ابا جان اس طرح غائب ہیں۔ جیسے گدھے کے سر سے سینگ۔ وہ اس قاتل کے پیچھے کیا گئے کہ یوں لگتا ہے، جیسے انھیں گئے صدیاں بیت گئی ہوں۔"

"ان کا فون آیا تھا۔ اکرام صاحب کو انھوں نے کہیں بلایا تھا۔" محمد حسین آزاد نے چونک کر کہا۔

"اوہ! لیکن کہاں؟"

"انھوں نے ضرور روزنامچے میں درج کیا ہوگا۔"

"خیر۔ ان سے فرصت ملے گی تو ہم دیکھ لیں گے کہ وہ کہاں گئے ہیں۔ ویسے تو ہمیں زیادہ فکر کرنے کی ضرورت نہیں۔ وہ آ ہی جائیں گے۔ اپنا کام مکمل کیے بغیر آنا انھیں

وں بھی پسند نہیں:" محمود نے جلدی جلدی کہا۔

"اچھا مسٹر — وہ نامعلوم آدمی تمہیں ہدایات کس طرح دیتا ہے — کہاں تم سے ملاقات کرتا ہے؟"

"ہمارے پیارے شہر میں اس نے کئی اڈے بنا رکھے ہیں — ان اڈوں پر اس کے احکامات بذریعہ وائرلیس موصول ہوتے ہیں۔"

"ایسے باس ہمیں ایک آنکھ نہیں بھاتے۔" فاروق نے جل کر کہا۔

"تو پھر کیسے بھاتے ہیں؟" محمد حسین آزاد نے فوراً کہا۔

"آپ ان حضرت کو لے جائیں — اور پیار محبت سے کچھ اگلوانے کی بھی کوشش کریں — اور ہاں! ان حضرت کی انگلیوں کے نشانات اور تصاویر وغیرہ ضرور لے لیں — ہو سکتا ہے — ان کا باس واقعی انھیں جیل میں نہ رہنے دے — یہ بھی تو ہو سکتا ہے — ان کا باس کوئی سپرنٹنڈنٹ جیل ہو۔"

"ہاں واقعی — سپرنٹنڈنٹ جیل کے لیے ایسا کرنا کچھ مشکل نہیں ہے۔"

"لیکن بھئی — وہ خانہ پُری کیسے کرتے ہوں گے — آخر انھیں تعداد تو پوری رکھنا پڑتی ہے۔"

"بھئی اپنے آدمی کی جگہ کوئی اور آدمی باہر سے پکڑ کر
بند کر دیتے ہوں گے — پاگل قسم کا۔"

"کچھ بھی ہو — مزا نہیں آیا۔"

"بھئی مزا آیا یا نہیں آیا — ایک بات ثابت ہو گئی — کوئی نامعلوم آدمی ہر اس شخص کو قتل کر دینا چاہتا ہے و افریقہ کی سیر میں شریک تھا، کیونکہ واقعات صرف اور صرف ان کے ساتھ پیش آ رہے ہیں۔" محمود نے جلدی جلدی کہا۔

"لیکن محمود — ڈاکٹر واک تو اس سیر میں شریک نہیں تھے۔"

"ہاں! ڈاکٹر واک کا قصور اتنا تھا کہ انھوں نے کانٹوں کی موت کا علاج دریافت کر لیا تھا — قاتل کو خوف محسوس ہوا کہ کہیں اس کا ہر شکار جا کر اس سے انجکشن نہ لگوا آئے، ر یہاں جو انجکشن لائے گئے تھے — وہ بھی چرا لیے گئے — ب سکتا ہے راجا فیروزی صاحب کا — ایک تو ان کے کول پر چاند ابھر آیا ہے، دوسرے انھیں اس نقاب پوش ے ذریعے بھی ہلاک کرانے کی کوشش کی گئی — کیا نیلا چاند ب ناکام ہو گیا ہے — یہ بات سمجھ میں آئی نہیں۔"

"ایک کیا — نہ جانے کتنی باتیں ہماری سمجھ میں نہیں آئیں۔"

"نقاب پوش سے تو ہم نپٹ چکے — اب نیلے چاند

کا کیا کریں؟

"ہاں! ارے ہاں" فاروق اچھل پڑا۔

"ہاں ارے ہاں — یہ کیا ہوا بھئی" فرزانہ نے بُرا سا منہ بنایا۔

"ایک خیال — بہت خوب صورت خیال" فاروق پُرجوش انداز میں بولا۔

"خیال اور تمھارے ذہن میں، وہ بھی فرزانہ کی موجودگی میں ... دماغ تو نہیں چل گیا" محمود نے حیران ہو کر کہا۔

"لیجیے — یہ بھی دماغ چلنے کی بات ہو گئی — اگر میرا دماغ چل گیا ہے تو پھر اس میں خیال کس طرح آ سکتا ہے؟"

"ہاں واقعی — یہ بات بھی ہے — گویا دو میں سے ایک بات ماننا پڑے گی — یہ کہ یا تو تمھارا دماغ چل گیا ہے اور تمھیں کوئی خیال نہیں سوجھا — یا خیال سوجھا ہے اور دماغ نہیں چلا۔"

"ادھر اُدھر کی ہانکے چلے جا رہے ہو اور فاروق سے یہ نہیں پوچھتے کہ خیال کیا سوجھا ہے" پروفیسر داؤد نے جلا کر کہا۔

"وہ اس لیے انکل کہ بات میرے دماغ سے نکل جائے اور یہ خوب مذاق اڑا سکیں" فاروق نے فوراً کہا۔

"تو تم اس بات کو اپنے دماغ میں جکڑ کر کیوں نہیں رکھتے" فرزانہ مسکرائی۔

"اب تم نے کہا ہے تو مجھے جکڑنا ہی پڑے گا" فاروق نے زور سے دانت بھینچے۔

"دھت تیرے کی — ارے بھائی اس سے یہ کہیں بہتر ہے کہ تم بات بتا دو" خان رحمان بولے۔

"تکیہ کلام غوطہ کھا گیا" فاروق خوش ہو کر بولا۔

"اب تم خود بتانے کے موڈ میں نہیں ہو" خان رحمان بُرا مان گئے۔

"نہیں انکل — یہ بات نہیں — لیجیے میں بتا رہا ہوں — خیال یہ ہے کہ وہ جو انگلش چرائے گئے ہیں، ضرور ان لوگوں میں سے کسی ایک نے چرائے ہیں — جو افریقہ کی سیر میں شریک تھے۔"

"وہ ہاں! یہ تو ہے — تو پھر"

"پھر یہ کہ ہم خفیہ طور پر ان کی تلاشی لے لیتے ہیں"

"ارے واہ! مزا آ گیا — یہ تو بہت خوب صورت خیال ہے" محمود نے پُرجوش انداز میں کہا۔

"یہ — یہ تم کہہ رہے ہو محمود" فاروق نے بوکھلا کر کہا۔

"ہاں! بالکل میں کہہ رہا ہوں"

"ارے بھئی — یہ خیال فرزانہ نے نہیں — میں نے پیش

کیا ہے۔"

"تو کیا ہوا — ہے تو زوردار۔"

فرزانہ کا منہ بن گیا اور اس نے جلے کٹے انداز میں کہا:

"اس میں شک نہیں کہ یہ خیال بہت زوردار ہے —

اور ہمیں اس پر عمل کرنا ہی پڑے گا۔"

"تو بُرے بُرے منہ کس خوشی میں بنا رہی ہو — کیا

اچھے منہ ادھار دے دیے ہیں؟"

"لاؤ بھئی لاؤ — وہ لسٹ نکالو — جس میں ان سب کے

نام ہیں۔"

محمود نے وہ کاغذ جیب سے نکالا:

"اس میں سب سے پہلا نام سر ابدال خان کا ہے —

ان پر نیلے چاند کا حملہ سب سے پہلے ہوا، لیکن وہ ڈاکٹر

واک کے انجکشن کی وجہ سے بچ گئے۔"

"تو کیا ہوا — دوبارہ حملہ ہو سکتا ہے۔"

"ہم اس وقت دوبارہ یا سہ بارہ حملے کا نہیں — اس

بات کا جائزہ لے رہے ہیں کہ وہ دس انجکشن کہاں ہیں —

اگر وہ انجکشن ہم تلاش کر لیتے ہیں — تو گویا راجا فیروزی کی

جان بچ سکتی ہے۔"

"ہوں! خیر — دوسرا نام ہے طالب کامرانی — اور تیسرا نام

ہے راجا فیروزی کا — اس کے بعد یہ سات نام اور ہیں —

رشاد گوہا، رفیق موسیٰ، سلطان خاور، رؤف باوا، الماس آگی،

ملاکس خان — خواجہ عباس — ان کے پتے بھی کاغذ پر درج

ہیں — گویا ان کل دس گھروں میں ہمیں انجکشن تلاش کرنا

ہوں گے۔"

"اور یہ کوئی آسان کام نہیں ہوگا — صرف ایک گھر

میں تلاش کرنے میں ایک رات بیت جائے گی۔" فرزانہ

نے کہا۔

"تو پھر ہم ایک ایک، ایک ایک گھر میں چلے جاتے ہیں۔"

فاروق بولا۔

"توبہ ہے — ایک جملے میں چار مرتبہ لفظ ایک استعمال کیا۔"

فرزانہ نے اسے گھورا۔

"لیکن اس میں میرا کیا قصور۔"

"ہاں! یہ بھی ٹھیک ہے — ایک ترکیب تو یہ ہو سکتی ہے

کہ ہر گھر میں ایک آدمی جائے، اس طرح آج رات ہی پانچ

گھر چیک ہو جائیں گے۔" فرزانہ نے جلدی جلدی کہا۔

"پانچ گھر کس طرح — اب تم حساب میں بھی کمزور ہو چلی ہو۔

ہم پانچ نہیں تین ہیں۔"

"میں نے انکل خان رحمان اور پروفیسر انکل کو بھی گنا ہے۔"

"اچھا — تو کیا ہم اکیلے یہ کام کریں گے؟" پروفیسر داؤد گھبرا اٹھے۔

"کیا حرج ہے انکل — مہم ہی سہی۔"

"ہاں — لیکن بھئی — ہم تم لوگوں میں سے کسی ایک کے ساتھ تو یہ کام کر سکتے ہیں — تنہا نہیں۔"

"بالکل ٹھیک — میں بھی یہی کہتا ہوں۔" خان رحمان بولے۔

"خیر، یونہی سہی — آپ فاروق کے ساتھ چلے جائیں — میں پروفیسر انکل کو ساتھ لے جاتی ہوں — محمود اکیلا جائے گا۔"

"کیوں! اس نے کیا کیا ہے؟"

"تو پھر تم محمد حسین آزاد کو ساتھ لے لو۔"

"چلو ٹھیک ہے۔ مجھے کوئی اعتراض نہیں۔"

"اس طرح ایک وقت میں ہم تین گھروں کی تلاشی لے سکیں گے۔"

"لیکن ہمیں دس کے دس گھر ایک ہی رات میں چیک کرنا ہوں گے — ورنہ راجا فیروزی کی زندگی خطرے میں پڑ جائے گی۔" محمود نے کہا۔

"تو پھر ایسا کر لیتے ہیں کہ ہر گھر میں تین گھنٹے سے زیادہ نہیں لگائیں گے — اس طرح ہم نو گھنٹوں میں نو گھر دیکھ لیں

گے — باقی رہ جائے گا ایک گھر — میرا خیال ہے، اس گھر کو چیک کرنے کی ضرورت ہی نہیں ہے۔"

"تو پھر بسم اللہ کریں۔" فرزانہ نے کہا۔

"پہلے ہمیں رات ہونے کا انتظار کرنا ہے — گھر کے لوگوں کو گہری نیند سوتے رہنے کے قابل بنانا ہے — یہ کام پروفیسر انکل کریں گے۔"

"کیا مطلب — کیا میں ہر گھر میں جا کر پہلے ان سب کو سلاؤں۔"

"نہیں، پہلے آپ صرف ایک گھر میں جائیں — اور وہاں ایسی گیس چھوڑ آئیں کہ وہ سب سو جائیں — پہلی پارٹی اس گھر میں داخل ہو جائے گی — پھر آپ دوسرے گھر میں — اور دوسری پارٹی وہاں — تیسری میں آپ خود ہی موجود ہوں گے۔"

انھوں نے ترتیب کے مطابق پروگرام شروع کیا — پروفیسر داؤد کا کام آسان تھا — ایک پلاسٹک بیگ میں وہ خفیہ طور پر گیس لے گئے اور گھر میں ملاقات کے دوران اس کا منہ کھول دیا — گیس غیر محسوس طور پر نکلتی چلی گئی — یہاں تک کہ بیگ خالی ہو گیا — گھر والوں کو پتا بھی نہ چلا — گیس کو تو دو منٹ بعد اثر شروع کرنا تھا — لہٰذا وہ باہر نکل آئے — کسی بہانے سے ان لوگوں کے گھروں میں جانا ان کے لیے مشکل نہیں تھا، کیونکہ وہ سب انھیں جانتے تھے — پہلی

پڈی اس گھر میں جب پندرہ منٹ بعد داخل ہوئی تو سب
گھر والے گہری نیند میں غرق تھے اور ان کے آدھ گھنٹے سے
پہلے اٹھنے کے کوئی امکانات نہیں تھے۔

اسی طرح پروفیسر داؤد نے دو اور گھروں پر نیند طاری
کر دی۔ اور تلاشی کا کام شروع ہو گیا۔ پھر دوسرے تین
گھروں کی باری آئی۔ پھر تیسرے تین کی۔ یہاں تک کہ
نو کے نو گھر دیکھ ڈالے گئے، لیکن ان انجکشنوں کا کسی گھر
میں نام و نشان تک نظر نہ آیا۔

"یہ کوئی بات نہ ہوئی۔"

"ہو سکتا ہے۔ اس شخص نے ان انجکشنوں کو ضائع کر دیا
ہو، کیونکہ وہ اس کے لیے خطرناک تھے۔"

"لیکن اس کے باوجود وہ اس کے کام آ سکتے تھے۔ ذرا
سوچو۔ ایک شخص کے گال میں وہ نیلا چاند نمودار ہو جاتا
ہے۔ اور کوئی نامعلوم آدمی فون پر اسے بتاتا ہے کہ اس
کے پاس وہ انجکشن ہیں جو ڈاکٹر واک سے لیے گئے تھے۔ تو
وہ ایک انجکشن کی کتنی قیمت دینے کے لیے تیار نہیں ہو
جائے گا۔"

"اوہ ہاں! وہ تو اس کی ساری دولت بھی طلب کر سکتا ہے
اور نیلے چاند کا شکار دینے پر مجبور ہوگا۔"

"تب پھر۔ اس نے وہ انجکشن کہیں اور چھپا کر رکھے ہیں۔"

"یہ بھی تو ہو سکتا ہے۔ انجکشن ان میں سے کسی کے پاس
ہوں ہی نہ۔ اور کسی اور نے چرائے ہوں۔"

"ہوں! اس کا بھی کسی حد تک امکان ہے۔"

"فی الحال تو ہم چکر پر چکر کھا رہے ہیں۔ اور بات نہیں
بن رہی۔" فرزانہ نے تھکے تھکے انداز میں کہا۔

"اوہو۔ ہم ایک بہت اہم بات نظر انداز کر گئے،
ورنہ انجکشن ضرور مل گئے ہوتے۔" فاروق زور سے اچھلا۔ اس
کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔

حملہ

ہال میں چند مسلح آدمی داخل ہوئے، امیر خان دلاوری اور اس کی بیٹی ان کی نگرانی میں چلے آ رہے تھے۔

"آؤ میرے دوست آؤ۔ دیکھو۔ تمھاری تلاش میں کون آیا ہے۔"

"کون آیا ہے۔ اور اگر کوئی آیا تھا تو اسے ختم کیوں نہیں کر دیا گیا۔"

"یہ کوئی مشکل کام تو ہے نہیں۔ اب کر لیں گے۔"

امیر خان دلاوری اور نورین او نے اس طرف دیکھا اور پھر طنزیہ انداز میں مسکرا دیے:

"اوہو۔۔ یہ تو انسپکٹر جمشید ہیں۔"

"ہاں! یہ ہم ہی ہیں۔ آپ کو اور آپ کی بیٹی کو گرفتار کرنے آئے ہیں اور گرفتار کر کے لے جائیں گے۔" انسپکٹر جمشید نے پُرسکون آواز میں کہا۔

"آپ نے سُنا میرے دوست۔"

"تم میری شرط مان لو تا۔ پھر دیکھو۔ میں کیسے نظارے دکھاتا ہوں۔"

"میرے دوست۔ یہ وقت شرطیں منوانے کا نہیں۔ اس پر ہم بعد میں باتیں کر لیں گے۔ پہلے تو ان دونوں کو ختم کر لو۔ وہ بھی پہلی فرصت میں۔ ورنہ یہ کوئی گل کھلا بیٹھیں گے۔"

"اچھی بات ہے۔ یونہی سہی۔ ان دونوں کو باہر لے جا کر ہلاک کر دو۔ جب تک ہم لاشیں نہ دیکھ لیں۔ ان کو سمندر میں نہ پھینکنا۔" اس نے سرد آواز میں کہا۔

"بہت بہتر سرکار۔ چلو۔" پہرے داروں میں سے ایک نے کہا۔

"ضرور چلیں گے، لیکن ایک بات کان کھول کر سُن لو۔" انسپکٹر جمشید نے مسکرا کر کہا۔

"اور وہ کیا؟" حاکم غرّایا۔

"تمھارا وقت آ چکا ہے۔ اب تم اس ریاست پر حکومت نہیں کر سکو گے۔"

"جاؤ جاؤ۔ تم تو اپنی موت سے ملاقات کرو۔" وہ ہنسا۔

وہ پہرے داروں کے آگے چلتے ہوئے ہال سے نکل

آئے۔ انھیں سمندر کے کنارے لایا گیا۔

"ہم جس کو بھی سزا دیتے ہیں سمندر کے عین کنارے،
تاکہ ہمیں محنت اور مشقت نہ کرنا پڑے۔ نہ فرش دھونا
پڑے، نہ لاش کو ٹھکانے کے سلسلے میں مصیبت اٹھانا پڑے،
سمندر کی لہریں آپ کو خود ہی زمین کو صاف کر دیتی ہیں۔
اور لاش کو ذرا سا دھکا دینا پڑتا ہے۔"

"خوب! کہیں آج یہی سلوک تم سے نہ ہو۔ مجھے یہ ڈر ہے۔"

"ہم سے۔ وہ کیسے۔ اس وقت پوری ایک فوج یہاں
موجود ہے۔ جو تم لوگوں کی تکا بوٹی کرنے کے لیے تیار ہے۔"

"اچھی بات ہے۔ اب جو کچھ بھی ہوگا، اس کی ذمے داری
تم پر ہوگی۔" انسپکٹر جمشید نے سرد آواز میں کہا۔

"بالکل۔۔ ہم ہی ذمے دار ہوں گے اور کیا مرنے کے
بعد بھی تم ذمے دار ہو گے۔" وہ ہنسا۔ پھر سب زور زور
سے ہنسنے لگے۔

آخر وہ عین کنارے پر آ گئے۔ سمندر کی لہریں ان کے
پیروں تک آ رہی تھیں۔ وہ انھیں کنارے پر کھڑا کرنے
کے بعد خود پیچھے ہٹنے لگے۔ یہاں تک کہ کافی فاصلے پر
پہنچ گئے۔

"اپنی موت کو اپنی آنکھوں سے دیکھ لو۔"

"اکرام۔ ترکیب نمبر تیرہ۔" انسپکٹر جمشید نے دبی آواز میں کہا۔

"او کے سر۔"

دونوں ایک ساتھ سمندر میں چھلانگیں لگا گئے۔

"ارے ارے۔ بھئی کہاں جاؤ گے اس طرح۔ کیا سمندر
میں تیر کر اپنے ملک پہنچ جاؤ گے۔ لانچ تو تمھاری ہمارے
قبضے میں ہے۔" کسی نے چیخ کر کہا۔

دونوں غوطہ لگا کر پانی میں گم ہو چکے تھے۔ ریاست کے
پہرے دار دوڑ کر کنارے پر پہنچے اور بے تحاشا فائرنگ
شروع کر دی، لیکن اتنی دیر وہ دونوں تو کہیں کے کہیں پہنچ
چکے تھے اور نیچے ہی نیچے چلے جا رہے تھے۔ حملہ کرنے
والے سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ کوئی اتنی دیر بھی پانی میں
رہ سکتا ہے۔ بہت دور جا کر انھوں نے سر تھوڑا سا
ابھارا۔ سانس لیے اور پھر پانی میں۔ چاروں طرف اندھا دھند
قسم کی فائرنگ ہو رہی تھی۔ نشانہ لگا کر تو کوئی فائرنگ کر
نہیں رہا تھا۔

وہ مسلسل تیرتے رہے۔ یہاں تک کہ ایک چھوٹے سے
جزیرے تک پہنچ گئے۔

"وہ لوگ تعاقب میں آئیں گے سر۔ اور اس جزیرے
تک ضرور پہنچیں گے۔" اکرام نے کہا۔

"یہی تو میں چاہتا ہوں۔" وہ مسکرائے۔

"جی ۔ کیا مطلب؟"

"جب تک ہمارے پاس لانچ نہیں ہو گی ۔ ہم اپنے ساحل تک نہیں پہنچ سکیں گے ۔ وہ یہاں تک آئیں گے تو لانچ ہمارے ہاتھ لگے گی نا۔"

"لیکن ہم دونوں بالکل نہتے ہیں ۔ کوئی ہتھیار پاس نہیں۔"

"کوئی پروا نہیں۔" وہ مسکرائے۔

جلد ہی انھوں نے لانچ کی آواز سن لی۔

"وہ آ رہے ہیں ۔ آؤ۔" انسپکٹر جمشید نے فوراً کہا۔

دونوں اپنی کارروائی میں مصروف ہو گئے ۔ تین منٹ بعد لانچ ساحل سے آ لگی ۔ اور اس پر سے بیس کے قریب آدمی اُترے۔

"ان کے پاس کوئی ہتھیار نہیں ہے ۔ بے دھڑک آگے ڈھو۔" کسی نے بلند آواز میں کہا۔

وہ ایک قطار میں آگے بڑھتے چلے گئے ۔ اچانک ایک درخت کے پیچھے سے ایک ہاتھ نکلا اور آخری آدمی کو گردن سے پکڑ کر کھینچ لیا گیا ۔ اس طرح پکڑا تھا کہ وہ آواز تک نہ نکال سکا ۔ اب اس کی رائفل انسپکٹر جمشید کے ہاتھ میں تھی ۔ وہ آگے بڑھے اور دوسرے آدمی پر ہاتھ ڈال

دیا ۔ اس کا بھی وہی انجام ہوا ۔ اب اکرام کے پاس بھی رائفل آ گئی۔

دونوں نے دو گھنے درختوں کو چن لیا ۔ اور نشانے لے کر باڑھ ماری ۔ دشمنوں کی قطار گرتی چلی گئی ۔ آن کی آن میں اٹھارہ آدمی ڈھیر ہو گئے ۔ اب وہ لانچ کی طرف متوجہ ہوئے۔

"اس پر بھی ایک دو آدمی تو ضرور ہوں گے ، لیکن وہ خیال کر رہے ہوں گے کہ ان کے ساتھیوں نے میدان مار لیا۔" انسپکٹر جمشید مسکرائے۔

"جی ہاں ! لیکن ہم ان کا کیا کریں۔"

"ان کا بندوبست بھی کرنا ہو گا ۔ اس وقت وہ محفوظ ہیں ۔ اور ہم ان کے مقابلے میں خطرے میں ۔ کیونکہ ہمیں لانچ پر جانے کے لیے ان کے سامنے آنا پڑے گا۔"

"تب پھر ۔ چکر کاٹ کر کیوں نہ چلیں۔"

"ہاں ! اس کے سوا کیا کیا جا سکتا ہے۔"

انھوں نے ایک چکر کاٹا اور سمندر میں اتر گئے ، پھر ایک لمبا چکر لگا کر لانچ تک پہنچے اور اس پر سوار ہو گئے۔ لیکن لانچ پر کوئی نہیں تھا ۔

"ہم نے بلاوجہ اتنی محنت کی: اکرام نے منہ بنایا۔
"یہ بات نہیں۔ وہ دیکھو۔ وہ آ رہے ہیں۔ غالباً ان
کے ساتھی واپس نہ آئے تو یہ صورتِ حال معلوم کرنے
نیچے اُتر گئے۔ اب لوٹ رہے ہیں۔ دیکھو تو۔ ان کے
چہروں پر کتنا خوف ہے:"

وہ ان کے نزدیک آنے کا انتظار کرتے رہے۔ آخر
وہ لانچ پر سوار ہوئے اور فوراً ہی ان کی گردنیں ان کے
ہاتھوں میں آگئیں۔ جلد ہی ان کی لاشیں سمندر میں تیر
رہی تھیں۔ اور لانچ ان کے ساحل کی طرف اڑی جا رہی
تھی۔ ساحل پر اتر کر انھوں نے فوراً فون کیا اور ساری
صورتِ حال بتائی۔ آدھ گھنٹے بعد ایک بحری بیڑا ریاست کی
طرف بڑھ رہا تھا اور اس کی کمان انسپکٹر جمشید کر رہے تھے۔
ایک گھنٹے بعد ریاست کی فوج اور بحری بیڑے کے درمیان
مقابلہ شروع ہو چکا تھا، لیکن اس مقابلے سے زیادہ اثر
انسپکٹر جمشید کی تقریر کا ہو رہا تھا۔ وہ سپیکر پر کہہ رہے تھے:

"ریاست کے لوگو۔ ہوش کرو۔ ہم تمھارے دشمن
نہیں، دوست ہیں۔ تمھیں اس نالائق حکمران سے نجات
دلانے آئے ہیں۔ تم نے ایک لٹیرے کو اپنا حکمران
بنا لیا ہے۔ ایک سمگلر کو۔ جو ہمارے ملک کا

بدنام ترین شخص تھا اور اخبارات میں تم لوگ اس
کے بارے میں پڑھتے ہی رہے ہو، لیکن اب وہ
میک اپ میں اس ریاست کا حکمران بنا بیٹھا ہے۔
اب ذہن میں سوال پیدا ہو سکتا ہے کہ بھلا یہ کیسے
ممکن ہے۔ اس سلسلے میں نہ جانے کتنے بڑے بڑے
چکر چلائے گئے ہوں گے، لیکن میں آپ کو بتا دیتا
ہوں۔ آپ کو دراصل اس بات کے ثبوت کی
ضرورت ہے نا۔ کہ آپ کا حکمران واقعی ایک سمگلر
ہے۔ تو اس کا ثبوت یہ ہے کہ آپ سب جمع
ہو کر اپنے حکمران سے کہیے کہ وہ اپنے چہرے کا
جائزہ لینے دے۔ میک اپ کے کسی ماہر سے کہیے
کہ اس کے چہرے سے میک اپ اتار پھینکے، پھر
دیکھیے کس طرح دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی ہوتا
ہے۔ ایک سمگلر کبھی بھی اچھا حکمران نہیں ہو سکتا،
یہ میرا دعویٰ ہے۔ اگر نہیں تو پھر میری فوج
بہت جلد اس بات کا فیصلہ کر دے گی اور میں
خود اس کے چہرے سے نقاب الٹوں گا۔ بھاگ تو
اب وہ سکے گا نہیں، کیونکہ میری فوج نے جزیرے
کو چاروں طرف سے گھیر لیا ہے۔"

ان کی اس تقریر کا اثر پوری ریاست میں ہو گیا۔ چہ میگوئیاں ہونے لگیں۔ لوگ ایک دوسرے سے پوچھنے لگے۔ کیا واقعی۔ ان کا حکمران ایک سمگلر ہے۔ ایک بدنام شخص ہے۔ ادھر حکمران کی طرف سے اعلان ہوا:

"ایسی باتوں پر توجہ نہ دو۔ یہ شکست دینے کی چال ہے۔ میرے سپاہیو۔ جان توڑ کر لڑو، پھر دیکھنا ہم انھیں کیسا مزا چکھاتے ہیں۔" یہ تقریر وہ ایک مجمعے میں کر رہا تھا۔

"تو پھر آپ اپنے عوام کا شک کیوں نہیں دور کر دیتے۔" مجمعے میں سے کسی نے چلا کر کہا۔

"یہ کون بولا۔ سامنے آئے۔ میں اس کی زبان کاٹ دینا پسند کروں گا۔"

سب کو سانپ سونگھ گیا۔ کوئی بھی یہ بتانے کے لیے تیار نہ ہوا کہ کون بولا تھا، پھر بے شمار لوگ چلائے:

"ثبوت دیں۔ اپنا چہرہ چیک کرائیں۔ اس مجمعے میں میک اپ کے ماہرین موجود ہیں۔"

حکمران گھبرا گیا۔ اس نے چیخ کر کہا:

"خاموش! مجھے کسی کو ثبوت دینے کی ضرورت نہیں، میں تمھارا حکمران ہوں۔ تم میرے حکمران نہیں ہو۔ اگر

زیادہ بکواس کی تو میں فوجیوں کو حکم دوں گا۔ وہ تم سب کو چھلنی کر دیں گے۔"

"ہاں ہاں۔ دیجیے۔ انھیں حکم۔ کرا دیجیے ہمیں چھلنی۔ لیکن اب ہم ثبوت کے بغیر ٹلنے والے نہیں۔"

"چلا دو ان پر گولی۔" اس نے حکم دیا۔

لیکن گولیاں چلنے کی آواز سنائی نہ دی۔

"یہ کیا۔ کیا تم پتھر کے بن گئے ہو۔ بہرے ہو گئے ہو۔"

"آپ ثبوت کیوں نہیں دیتے آخر۔ ہمارے فوجیوں کو کیوں مروا رہے ہیں۔ انسپکٹر جمشید کی فوج ہر لمحے ہم پر چھا رہی ہے۔ آخر اس لڑائی کا کیا فائدہ۔ جب کہ یہ لڑائی صرف آپ کا چہرہ چیک کر لینے کے بعد ختم ہو سکتی ہے۔"

"نہیں! میں اپنا چہرہ چیک نہیں کراؤں گا۔ یہ میرے لیے بہت ذلت کی بات ہوگی۔"

"تو پھر ہم آپ کا حکم نہیں مانیں گے۔ یہ لڑائی بند کرا دی جائے گی۔ آپ کو گرفتار کر لیا جائے گا۔" فوجیوں کے انچارج نے کہا۔

"یہ۔۔۔ یہ تم کہہ رہے ہو۔۔۔ میں تم پر غداری کا مقدمہ چلاؤں گا۔"

"ضرور۔ کیوں نہیں۔ میرے ساتھیو۔ ان کے گرد گھیرا
ڈال دو۔ انھیں جکڑ لو۔ اور میک اپ کے کسی ماہر سے کہیے
کہ ان کے چہرے کا جائزہ لے۔"
وہ چیختا چلاتا رہ گیا، لیکن اس کی کسی نے نہ سنی۔ انسپکٹر
جمشید کی تقریر میں اثر ہی کچھ ایسا تھا۔ میک اپ کے
ماہرین کی چند منٹ کی کوشش نے ہی میک اپ اتار دیا۔
اور مشہور سمگلر سیٹھ فیروز کا چہرہ نظر آنے لگا۔ لوگوں کے منہ
کھلے کے کھلے رہ گئے۔ فوراً جنگ بندی کا اعلان کر دیا
گیا۔ انسپکٹر جمشید کو جزیرے پر آنے کی دعوت دی گئی۔
ان کا زبردست استقبال کیا گیا۔ انھوں نے فوراً امیر خان
دلاوری اور اس کی بیٹی کی گرفتاری کی طرف توجہ دی۔ انھیں
بھی ایک گھر سے گرفتار کر لیا گیا۔ دونوں اس میں چھپے
ہوئے تھے۔

رخصت سے پہلے انھوں نے اعلان کیا:

"آپ لوگ اسلامی طریقے سے اپنا کوئی حاکم چن لیں۔ میں
اپنے مجرم لے جا رہا ہوں۔"

"ہم منتخب کرنے میں آپ ہماری مدد کریں۔" کمانڈر
نے کہا۔

"نہیں۔ میں اس معاملے میں دخل اندازی نہیں کروں

گا۔ جو آدمی فوجی معاملات کا ماہر ہو اور دین پر پوری
طرح کاربند ہو۔ اور انسانوں کے تمام معاملات کو
اچھی طرح سمجھنے والا ہو۔ اسے سب مل کر چن لیں۔
اس کے لیے ووٹ ڈالنے کی کوئی ضرورت نہیں، کیونکہ
عوام میں ان پڑھ لوگ بھی ہوتے ہیں۔ مفاد پرست
بھی ہوتے ہیں۔ لالچی بھی ہوتے ہیں۔ بکنے والے بھی
ہوتے ہیں۔ پیسے لے کر ووٹ ڈال دیتے ہیں۔ اس طرح
ملک میں صحیح حکومت نافذ نہیں ہونے پاتی۔ جمہوریت کا
اسلام سے دراصل کوئی تعلق نہیں ہے۔ کیا آپ لوگ سمجھ گئے؟"

"جی ہاں! سمجھ گئے۔ ہم آج ہی یہ فیصلہ کر لیں گے
اور آپ کو بھی اطلاع دیں گے۔ کسی روز آ کر آپ یہاں کا
جائزہ لے جائیے گا۔"

"میں ایسا ضرور کروں گا۔ اور اپنے بچوں کو بھی ساتھ
لاؤں گا۔ وہ اس ریاست کے نئے نظام کو اور نئے
حاکم کو دیکھ کر بہت خوش ہوں گے۔ نیا نظام شاید میں
غلط کہہ گیا۔ مجھے کہنا چاہیے تھا۔ چودہ سو سال پہلے کے
نظام کو ریاست پر لاگو دیکھ کر بہت خوش ہوں گے۔"

آخر وہ وہاں سے رخصت ہوئے۔ ہزاروں لوگوں نے ساحل
پر کھڑے ہو کر پُرجوش انداز میں انھیں رخصت کیا۔ انسپکٹر

جمشید انھیں پہلے صدر صاحب کے پاس لے گئے، انھیں ساری صورتِ حال بتائی — صدر صاحب بولے:

"ٹھیک ہے — اگر یہ دونوں یا ان میں سے ایک مجرم ثابت ہوتا ہے تو میں سفارش نہیں کروں گا — اور ان کے لیے کسی کی سفارش نہیں سنوں گا۔"

"شکریہ سر! میں یہی چاہتا ہوں — اگر یہ ہمارے ملک کے ہمدرد ہوتے تو اس ریاست میں جا کر کیوں پناہ لیتے، نہیں رہتے — حالات کا ڈٹ کر مقابلہ کرتے — عدالت کا سامنے کرتے اور ان کے بارے میں جو فیصلہ ہوتا، اس کو قبول کرتے۔"

"تم ٹھیک کہتے ہو جمشید — میں تم سے پوری طرح اتفاق کرتا ہوں۔"

"شکریہ سر۔"

وہ انھیں لے کر کمرۂ امتحان میں آئے — اب ان کے چہرے بالکل مُردہ نظر آ رہے تھے:

"مجھے اس میں ایک فی صد بھی شک نہیں کہ نورین لو نے راجا فیروزی کو قتل کیا ہے — کسی زہریلی سوئی کے ذریعے، اس سوئی پر کوئی خطرناک ترین زہر لگایا گیا تھا — اب صرف تمھارے بیان کی ضرورت ہے — یہ سن لو — اگر تم

نے سچ نہ اگلا تو میں بری طرح پیش آؤں گا۔"

"ہاں! میں نے راجا فیروزی کو قتل کیا ہے۔"

"بیٹی! یہ کیا کہہ رہی ہو؟"

"میں آپ کی بیٹی نہیں — آپ نے تو مجھے اغوا کیا تھا بچپن میں — اور اس وقت سے میں آپ کے لیے اس قسم کے غلط کام کر رہی ہوں — مجھے تو معلوم بھی نہیں میرے ماں باپ کون ہیں۔"

"کیا!!!" وہ حیران رہ گئے۔

"ہاں! یہ سچ ہے۔" وہ چلائے۔

"تو آپ کو یہ قتل کرنے کے لیے امیر خان ولادری نے کہا تھا؟"

"ہاں! بالکل — میرے پاس ان تمام باتوں کے ثبوت موجود ہیں — مجھے یہ جو حکم بھی دیتے رہے ہیں، میں وہ ٹیپ کرتی رہی ہوں۔"

"اوہ اوہ — کہاں ہے وہ ٹیپ؟"

"کوٹھی میں ہی ایک جگہ محفوظ ہے — یہ میں اس لیے کرتی رہی کہ کبھی اس شخص نے مجھے پھنسا کر خود بچنے کی کوشش کی تو ثبوت پیش کر سکوں۔"

"بہت خوب! آپ نے بہت عقل مندی سے کام لیا۔"

مسٹر دلاوری - اب آپ کیا کہتے ہیں - اب آپ کے بچنے کے امکانات ختم ہو چکے ہیں"

"ہاں ! یہ ٹھیک ہے - لیکن میں بھی یہ سب کچھ اپنے لیے نہیں کر رہا - میں تو خود کسی کے احکامات مانتا ہوں"

"کیا مطلب !" وہ حیران رہ گئے -

"اس ملک میں کوئی سمگلر ہے - بہت بڑا سمگلر - اس کے ہاتھ میں سونے ، چاندی اور ہیروں کی سمگلنگ ہے"

"لیکن - اس سمگلر کا افریقہ کی سیر سے کیا تعلق ہے ؟" انسپکٹر جمشید حیران ہو کر بولے -

"وہ سمگلر - سیر کرنے والے گروہ میں شامل تھا اور غالباً سمگلنگ کے لیے ان کے ساتھ چلا گیا تھا - لیکن وہاں ان میں سے کسی کو اس کا راز معلوم ہو گیا - اس نے اسے بلیک میل کرنا شروع کر دیا - اب وہ ان سب کو ایک ایک کر کے ہلاک کر دینا چاہتا ہے - جو اس سیر میں شامل تھے - ہلاک کرنے کے لیے اس نے اسی سیر کے دوران ملنے والے کانٹوں سے کام شروع کیا ہے - اس کا توڑ اگر ڈاکٹر واک کے پاس تھا - تو اس نے ڈاکٹر واک کو ختم کرا دیا یا خود کر دیا - پھر روگان کو بھی ختم کر دیا - شاید اسے کوئی بات معلوم تھی - غالباً یہ کہ سیر کرنے والوں میں سے کسی نے

وہ کانٹے اس کے ذریعے حاصل کیے تھے"

"اوہ !" وہ دھک سے رہ گئے - تمام کہانی سلجھتی جا رہی تھی - انھوں نے کہا :

"پھر تو معاملہ بہت آسان ہے - اگر اس نے یہ دونوں قتل خود کیے ہیں - تو ایئرپورٹ سے معلوم ہو جائے گا ، اس دن ان میں سے کس نے سفر کیا تھا"

"ہو سکتا ہے ، اس نے یہ سفر فرضی نام سے کیا ہو"

"اس کے باوجود ہم معلومات حاصل کر لیں گے" انھوں نے کہا -

"بہت مشکل ہے - وہ بہت چالاک ہے" امیر خان دلاوری نے کہا -

"آپ کو یہ سب باتیں کس طرح معلوم ہوئیں ؟"

"خود اس نے ساری باتیں بتائی تھیں ، کیونکہ اس ملک میں اس کا نائب میں ہوں"

"تب پھر آپ تو جانتے ہی ہوں گے - وہ کون ہے ؟"

"بس اس معاملے میں وہ کسی پر اعتبار کرنے پر تیار نہیں ہے - کسی کو نہیں معلوم - وہ کون ہے"

"تب پھر سیر کے دوران کسی کو اس کے بارے میں کس طرح معلوم ہو گیا ؟"

"وہ اپنے آپ سے باتیں کر رہا تھا، وہ ہم سبھی نے سُن لیں:"

"ہوں۔ اس کا مطلب ہے۔ ہمیں نہ صرف اس کا سراغ لگانا ہے۔ بلکہ اس بلیک میلر کا بھی۔ جو اسے بلیک میل کر رہا ہے، کیونکہ اگر وہ یہ بات ہمیں بتا دیتا تو یہ سارا چکر نہ چلتا اور وہ سیدھی سادی طرح گرفتار ہو جاتا۔ گویا وہ بھی برابر کا مجرم بن گیا۔ اور صرف لالچ میں آ کر۔ افسوس:"

"ہوں۔ نہ جانے وہ کون ہے:"

"ہم اس کا بھی سراغ لگا لیں گے۔ اب ہمارا کام آسان ہو گیا ہے۔ آؤ بھئی چلیں۔ یہ دونوں تو اب سرکاری مہمان بنے ہی رہیں گے:"

وہ اکرام کو ساتھ لیے باہر آ گئے۔ سب سے پہلے ایئر پورٹ کے عملے سے رابطہ قائم کیا۔ ان تاریخوں میں افریقہ کا سفر کس کس نے کیا تھا۔ یہ تمام معلومات حاصل کیں، پھر ان تاریخوں میں سیر کرنے والے اگر ملک میں تھے تو کہاں کہاں تھے۔ باہر تھے تو کہاں کہاں تھے۔ یہ تمام معلومات بھی انھوں نے حاصل کر لیں۔ اور آخر میں نتیجہ یہ نکالا کہ مجرم فرضی نام سے افریقہ گیا تھا اور ڈاکٹر واک اور روگان کو ٹھکانے لگا کر لوٹ آیا تھا۔ لیکن چونکہ اس دوران وہ ملک سے باہر رہا تھا۔ لہٰذا ملک میں نہیں تھا

اور اس نے اپنے آپ کو ملک میں دکھایا ہوا تھا۔ لہٰذا اس کا جھوٹ پکڑنا تھا، لیکن اس سے بھی زیادہ مشکل کام اس بلیک میلر کا سراغ لگانا تھا۔ لہٰذا انھوں نے سوچا پہلے محمود، فاروق اور فرزانہ سے ملاقات کر لی جائے۔ تاکہ معلوم ہو سکے۔ انھوں نے اس دوران کیا کام دکھایا ہے۔ چنانچہ انھوں نے گھر کا رخ کیا، لیکن محمود، فاروق اور فرزانہ غائب تھے اور ان کا کوئی پتا نہیں تھا۔ انسپکٹر جمشید نے پروفیسر داؤد اور خان رحمان کو فون کیا۔ وہ بھی نہیں ملے۔ بلکہ انھیں بتایا گیا کہ محمود، فاروق اور فرزانہ کے ساتھ گئے ہیں۔

یہ بات سن کر وہ مسکرا دیے:

"وہ بھی مہم پر ہی نکلے ہوئے ہیں:"

"گویا ہمیں ان کا انتظار کرنا ہوگا:" اکرام نے کہا۔

"اس طرح وقت ضائع ہوگا۔ اب ہم اپنے طور پر کام کریں گے:"

"لیکن اس سے پہلے آپ کھانا کھائیں گے۔ اور میں آپ کو کھانے کے بغیر ہرگز نہیں جانے دوں گی:" بیگم جمشید نے جھلا کر کہا۔

وہ مسکرا دیے۔ انسپکٹر جمشید نے کہا:

"ہم کھانے کے لیے تیار ہیں، لیکن اس دوران ہی کوئی

بات ہو گئی تو ہم کیا کر سکتے ہیں؟"

"کچھ بھی نہیں کر سکتے۔ صرف اتنا کر سکتے ہیں کہ کھانا کھا کر چلے جائیے گا۔"

"اور اگر اس کا وقت نہ ہو؟"

"نکل آئے گا وقت۔ آپ فکر نہ کریں۔"

"اچھا تو پھر لے آؤ کھانا۔" انھوں نے کہا۔

بیگم جمشید نے ابھی کھانے کی ٹرے ان کے سامنے رکھی ہی تھی کہ دروازے کی گھنٹی بجی۔

اس کا پول

"خیر تو ہے۔ آج ہر بات صرف فاروق کو سوجھ رہی ہے؟" خان رحمان حیران ہو کر بولے۔

"شاید میری عقل اس کی عقل میں حلول کر گئی ہے۔" فرزانہ نے بے چارگی کے عالم میں کہا۔

"حد ہو گئی۔ آج تک تو روحوں کے حلول ہونے کی باتیں سنتے رہے ہیں۔ اب عقلیں بھی ایک کی دوسرے میں حلول کرنے لگیں۔ ہے کوئی تک۔" فاروق نے جھلّا کر کہا۔

"ہونے کو اس دنیا میں کیا نہیں ہو سکتا۔ تم وہ بات بتاؤ۔ جس کو ہم نے نظر انداز کیا ہے۔ وقت بہت کم ہے۔" محمود بولا۔

"ارے ہاں۔ واقعی۔ بات یہ ہے کہ ہم نے اب تک نو گھروں کی تلاشی لی ہے۔ دسویں گھر کی تلاشی لینے کی ہم نے ضرورت ہی نہیں سمجھی تھی۔ لیکن ابّا جان کا ایک اصول

ہے ۔ اور چونکہ وہ ابا جان کا اصول ہے ، اس لیے وہ ہمارا
بھی شامل ہے ۔ یہ کہ کسی کو شک سے بُری نہ سمجھو ۔
جب کہ ہم نے ایک کو شک سے بُری سمجھ لیا ۔ کیا ہمیں
ایسا کرنے کا حق تھا؟

"ہرگز نہیں تھا۔"

"بس تو پھر ۔ دسویں گھر کی تلاشی بھی لے ڈالی جائے۔"

"لیکن اب دن نکلنے کے قریب ہے۔"

"تو کیا ہوا ۔ پہلے ہم انھیں گہری نیند میں مبتلا کریں
گے ۔ اور اس بار تو ہم سب ایک جگہ ہیں ، تلاشی لینے
میں اتنی دیر نہیں لگے گی۔"

"تو پھر ٹھیک ہے ۔ آئیے۔"

انھوں نے پروگرام کے مطابق تلاشی شروع کی ۔ ان کا
خیال تھا کہ وہ بہت جلد فارغ ہو جائیں گے ، لیکن اس
کوٹھی میں وہ اُلجھتے چلے گئے ۔ پہلے ایک چھوٹا تہ خانہ
دریافت ہوا ، لیکن وہاں کوئی خاص چیز نہیں تھی ۔ یوں لگتا
تھا جیسے وہ کوئی میٹنگ روم ہو ۔ لیکن پھر اس تہ خانے
سے ایک اور تہ خانے کا راستا مل گیا ۔ اب جو وہ
اس تہ خانے میں داخل ہوئے تو حیرت زدہ رہ گئے ۔
ان کی آنکھیں کھُلی کی کھُلی رہ گئیں ۔ اوپر کے سانس اُوپر اور

نیچے کے نیچے رہ گئے ۔

"اُف مالک ! یہ ہم کیا دیکھ رہے ہیں۔" فرزانہ بڑبڑائی ۔

"وہی دیکھ رہے ہیں ۔ جو نظر آ رہا ہے۔"

"اور میں کہتا ہوں ۔ ہمیں وہ دس انجکشن تلاش کرنے
چاہییں ۔ معاملہ راجا فیروزی کی زندگی اور موت کا ہے۔"

"بہول ٹھیک ہے۔"

وہ انجکشنوں کی تلاش میں جُٹ گئے ۔ آخر ایک گھنٹے
کی محنت کے بعد ایک خفیہ خانہ تلاش کرنے میں کامیاب
ہو ہی گئے ۔ اس میں وہ دس انجکشن موجود تھے ۔

"اب ان کا کیا کریں ۔ ساتھ لے چلیں۔"

"نہیں ۔ یہ پُورا تہ خانہ ۔ اور اس میں موجود یہ دس انجکشن
مجرم کے خلاف زبردست ثبوت ہیں ۔ اس ثبوت کو ہرگز
ضائع نہیں کرنا چاہیے۔"

"ٹھیک ہے ۔ آؤ چلیں۔"

انھوں نے اپنی آمد کے آثار مٹائے ۔ خانے کو جُوں کا
تُوں بند کیا ۔ تہ خانے کے راستوں کو بند کیا اور باہر آ
گئے ۔ گھر کے افراد ابھی تک گہری نیند میں غرق تھے ۔
وہ گھر سے نکل آئے ۔ سورج نکل چکا تھا ۔ بلکہ سورج سر
پر آ چکا تھا ۔ تہ خانے میں وقت گزرنے کا پتا ہی نہیں

چلا تھا۔

"ہم بہت تھک گئے ہیں۔ کیوں نہ گھر چلیں۔ نہا دھو کر ناشتا کر کے تازہ دم ہو جائیں۔ شاید ابا جان نے کوئی اطلاع دی ہو۔ یا شاید وہ لوٹ آئے ہوں۔"

"ٹھیک ہے۔ ناشتے والی بات پسند آئی۔" پروفیسر داؤد نے کہا۔

"اور باقی باتیں انکل؟" فرزانہ مسکرائی۔

"وہ بعد کی باتیں ہیں۔ آئیے چلیں۔"

وہ گھر پہنچے۔ اور یہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ اندر ایک گاڑی کھڑی تھی:

"اس کا مطلب ہے۔ ابا جان آ چکے ہیں۔"

"چلو شکر ہے۔ یہ اور اچھا ہوا۔"

انھوں نے دروازے کی گھنٹی کا بٹن دبایا۔ دروازہ کھلتے ہی السلام علیکم کی آوازیں گونجیں اور ساتھ ہی ناشتے کی خوشبو ان کے نتھنوں میں آئی:

"بھئی واہ مزا آ گیا۔ ناشتا بالکل تیار ہے۔" پروفیسر داؤد چہک اٹھے۔

"معلوم ہوتا ہے۔ بہت بھوک لگی ہے آپ کو؟"

"اس میں کیا شک ہے۔"

اور پھر وہ سب ناشتے میں مشغول ہو گئے۔ جب وہ اچھی طرح ناشتا کر چکے۔ ناشتے کے برتن صاف کر چکے تو بیگم جمشید نے خوش ہو کر کہا:

"اللہ کا شکر ہے۔ آج آپ نے اچھی طرح ناشتا کر ہی لیا۔"

"گویا اس سے پہلے آج تک پوری طرح ناشتا نہیں کیا۔"

"کیا تو خیر ہو گا۔ لیکن عام طور پر ہوتا یہی ہے۔ کہ اوہ ......" بیگم جمشید کہہ رہی تھیں کہ وہ بول اٹھے:

"پہلے ہمیں ایک دوسرے کی کارروائی سن لینے دیں۔"

"لیجیے۔ شروع ہو گیا کام۔"

"اب تمھارے لیے پریشانی کی کیا بات ہے۔ ناشتا تو ہم کر چکے۔"

"میں چاہتی تھی۔ آج آپ دوپہر کا کھانا بھی کھائیں۔"

"یہ ذرا ٹیڑھا مسئلہ ہے۔ کیونکہ ابھی ہمیں بہت کام ہے۔"

"بلکہ اصل کام تو ابھی باقی ہے۔" فاروق نے فوراً کہا۔

"اس کا مطلب ہے۔ کوئی کام دکھا کر آئے ہو۔" انسپکٹر جمشید چونکے۔

"خیال تو یہی ہے، لیکن ہمیں دیر نہیں کرنی چاہیے۔"

"اچھی بات ہے۔ پہلے تم ہی اپنی کہانی سناؤ۔" انھوں نے کہا۔

"لیکن ابا جان — ہم آپ کی کہانی سننے کے لیے بے چین بیٹھے ہیں۔"

"اور میں تمہاری۔" انھوں نے ہنس کر کہا۔

"تو پھر فیصلہ کیسے ہو؟"

"پہلے تم سناؤ جمشید۔" پروفیسر داؤد نے گویا حکم دیا۔

"لیجیے ہو گیا فیصلہ۔" فاروق نے خوش ہو کر کہا۔

"اچھی بات ہے — یونہی سہی۔"

انھوں نے فوزی او کے تعاقب سے شروع ہونے والی داستان سنا ڈالی — وہ حیرت زدہ رہ گئے — پھر بولے:

"اب تم سناؤ۔"

اب محمود نے اپنی ساری مہم سنا ڈالی — وہ بھی بہت حیران ہوئے — آخر بولے:

"لیکن بھئی — اس طرح وہ بلیک میلر رہ جائے گا — اس کی گرفتاری بہت ضروری ہے، کیونکہ یہ سب کچھ دراصل اس کی وجہ سے ہوا ہے — لیکن بہرحال — اس کی وجہ سے ایک بہت بڑا فائدہ بھی ہو گیا ہے — یہ کہ اس کی وجہ سے ایک اتنا بڑا سمگلر سامنے آ گیا ہے — جس نے پورے ملک میں سمگلنگ کا جال بچھایا ہوا ہے — اور جو ملک کے لیے انتہائی نقصان دہ ہے۔"

"سوال یہ ہے جمشید … اس بلیک میلر کا پتا کس طرح لگایا جائے۔" خان رحمان …

"اس سوال کا جواب فرزانہ دے گی۔" انسپکٹر جمشید بولے۔

"اس … میں فاروق ہی ترکیب بتائے گا — آج اس … میرا دماغ چرا لیا ہے۔" فرزانہ نے منہ بنایا۔

"ترکیب بالکل سامنے کی بات ہے۔" فاروق نے کہا۔

"اگر بات بالکل سامنے کی ہے تو ہمیں کیوں نظر نہیں … دی۔" محمود نے برا سا منہ بنایا۔

"نظر اپنی اپنی، خیال اپنا اپنا۔" فاروق گنگنایا۔

"کیا یہ کوئی ضرب المثل ہے؟" پروفیسر داؤد کے لہجے میں حیرت … آئی۔

"جی — پپ — پتا نہیں۔"

"ادھر ادھر کی ہانکنے کی بجائے، صرف اور صرف یہ … بتاؤ کہ بلیک میلر کا پتا کس طرح لگائیں؟"

"سمگلر تو بلیک میلر ہو نہیں سکتا — لہٰذا اسے الگ کر … دیں — باقی رہ ہی کتنے آدمی جاتے ہیں — ان میں سے ایک … بلیک میلر ہے۔"

"لیجیے — یہ اس نے ترکیب بتائی ہے۔" فرزانہ نے جھلا …

… کی گا …

"وہ مارا۔ اس بار ترکیب میرے ذہن میں آئی ہے۔" محمود نے چلا کر کہا۔

"چلو شکر ہے۔ فرزانہ تو پھر بھی رہ گئی۔"

"کوئی پروا نہیں۔ آج کا دن تمھارا ہی سہی۔ ترکیب بتاؤ۔"

"ان نو کے نو آدمیوں کو فون کیا جائے۔ سمگلر کی میں۔ کہا صرف یہ جائے۔ میں نے تمھیں پہچان لیا ہے بلیک میلر کہیں کے۔ میں نے اپنے آدمی تمھاری موت کے لیے بھیج دیے ہیں۔ یہ فون سنتے ہی جو بلیک میلر ہے۔ وہ تو بھاگ نکلے گا، کیونکہ وہ پولیس کو کچھ نہیں بتا سکتا، بتاتا ہے تو خود پھنستا ہے۔ لیکن باقی لوگ پولیس کو اطلاع کریں گے کہ انھیں موت کی دھمکی دی گئی ہے۔"

"بالکل ٹھیک۔ بہت محفوظ ترکیب ہے۔ اکرام ان نو کے نو آدمیوں کے گھروں کی نگرانی کے لیے فوراً آدمی روانہ کر دو اور انھیں ساری بات اچھی طرح سمجھا دو۔"

"او کے سر۔"

"اور دسویں آدمی یعنی سمگلر کی بھی نگرانی ہونی چاہیے۔ کہیں وہ کوئی گل نہ کھلا دے۔"

"بہت بہتر۔" اس نے کہا اور اٹھ کر فون کی طرف چلا گیا، پھر وہ فارغ ہو کر ان کی طرف لوٹ آیا:

"آدھ گھنٹے کے اندر اندر ہر گھر پر نگرانی کرنے والے پہنچ جائیں گے۔"

"بہت خوب! ہم بھی آدھ گھنٹے بعد کام شروع کریں گے۔"

آدھ گھنٹے بعد انسپکٹر جمشید نے فون شروع کیے۔ ان کے منہ سے سمگلر کی آواز نکل رہی تھی۔ خود سمگلر بھی سن لیتا تو چکر میں پڑ جاتا۔ کہ یہ اس کی آواز ان کے حلق سے کس طرح نکل رہی ہے۔

فون کرنے کے بعد وہ انتظار کرنے لگے۔ آخر ان کے فون کی گھنٹی بجی، انھوں نے فوراً ریسیور اٹھایا:

"سر۔ خواجہ عباس راجا اپنے گھر سے فرار ہوا ہے۔ اور اس نے شہر کے دوسرے سرے پر جا کر ایک مکان میں پناہ لی ہے۔"

"اس کی نگرانی ہو رہی ہے نا؟"

"جی ہاں! بالکل۔"

"ٹھیک ہے۔ وہ غائب نہ ہونے پائے۔ پہلے ہم سمگلر پر ہاتھ ڈالیں گے۔"

انھوں نے چند اور فون کیے۔ آئی جی صاحب وغیرہ کو بھی پروگرام کی اطلاع دی۔ وہ بھی وہاں پہنچ گئے اور پھر یہ چھوٹا سا قافلہ سمگلر صاحب کی طرف روانہ ہوا:

"تمھیں یقین ہے جمشید ۔ ہم غلط آدمی کو تو نہیں پکڑنے جا رہے" آئی جی صاحب نے فکرمندانہ لہجے میں کہا۔

"سر۔ مجھے یقین ہے۔ آپ مطمئن رہیں۔"

سمگلر کے گھر کو سادہ لباس والے پہلے ہی پوری طرح گھیر چکے تھے، لیکن غیر محسوس طور پر۔ کوئی بھی شخص یہ نہیں کہہ سکتا تھا کہ اس گھر کو گھیرے میں لیا جا چکا ہے۔ انسپکٹر جمشید جب سب کے ساتھ وہاں پہنچے تو انھوں نے ایک ہی نظر میں بھانپ لیا کہ نگرانی کا کام بالکل ٹھیک ہے۔ دوسرے یہ کہ گھر کے افراد کو اس نگرانی کا کوئی علم نہیں ہے۔ انھوں نے محمود سے کہا:

"آگے بڑھ کر دستک دو۔"

دستک کے ایک منٹ بعد ایک ملازم نے دروازہ کھولا اور اتنے بہت سے آدمیوں کو دیکھ کر پریشان ہو گیا۔ اس کے منہ سے نکلا:

"خیر تو ہے جناب؟"

"نہیں۔ خیریت نہیں ہے۔ ہم سر ابدال خان کو ایک بری خبر سنانے آئے ہیں۔"

"جی۔ بری خبر" اس نے چونک کر کہا۔

"تم انھیں اطلاع دو" انسپکٹر جمشید نے منہ بنایا اور وہ

اندر چلا گیا۔

فوراً ہی سر ابدال خان کی شکل دکھائی دی:

"یہ۔ یہ میں کیا دیکھ رہا ہوں۔ جمشید صاحب آپ بھی۔ آخر ایسی کیا بات ہو گئی۔ مجھے بلا لیا ہوتا۔"

"ہماری ڈیوٹی ہے۔ ہمیں ہی آنا چاہیے تھا" وہ بولے۔

"آئیے اندر۔ تشریف لے چلیے۔ بات کیا ہو گئی؟"

"ابھی بتاتے ہیں۔"

وہ انھیں ڈرائنگ روم میں لے آئے۔ اب سب لوگ کرسیوں اور صوفوں پر بیٹھ گئے۔

"میں بہت بے چینی اور پریشانی محسوس کر رہا ہوں۔ ذرا جلدی بتائیں" سر ابدال نے کہا۔

"ہم آپ کو یہ بتانے آئے ہیں کہ اس بلیک میلر کا پتا چل گیا ہے۔ جسے ختم کرنے کے لیے آپ اتنے پاپڑ بیل رہے ہیں۔"

"کیا مطلب؟" وہ بری طرح اچھلا۔

"جی ہاں! اس بلیک میلر کا نام ہے خواجہ عباس راجا۔"

"آپ یہ کیا باتیں کر رہے ہیں۔ کیا بلیک میلر۔ اور یہ نام تو میرے قریبی دوست کا ہے۔"

"جی ہاں! یہ آپ کا قریبی دوست ہے۔ اور افریقہ کی

سیر کے دوران بھی آپ کے ساتھ تھا — اسی نے تو آپ کی باتیں سُن لی تھیں — جب آپ اپنے آپ سے باتیں کر رہے تھے"

"اُف میرے مالک — یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں"

"اب انجان بننے سے کچھ فائدہ نہیں ہو گا جناب — آپ کا پول کھل چکا ہے"

"میرا پول — کیا مطلب؟"

"جی ہاں! آپ کا پول — آپ ہیں ہمارے مُلک کے سب سے بڑے سمگلر — پورے مُلک میں جنھوں نے سمگلنگ کا جال پھیلا رکھا ہے — اور یُوں بھی آپ چھپے رستم ہیں — اس مُلک میں بہت نمایاں حیثیت رکھتے ہیں — بڑے بڑے امیروں اور وزیروں سے آپ کے گہرے تعلقات ہیں، آپ انھیں دعوتیں دیتے رہتے ہیں — اسی لیے تو کوئی آپ کو، آپ کی گاڑی کو چیک نہیں کرتا — لیکن افریقہ کی سیر آپ کو لے بیٹھی — آپ کا سورج غروب کر دیا اس سیر نے"

"پتا نہیں، آپ کیا کہہ رہے ہیں"

"پتا تو سب کچھ ہے جناب آپ کو — جان بوجھ کر جو انجان بنے، وُہ تو یہی کہے گا کہ پتا نہیں" فاروق نے منہ بنایا۔

"اگر میں انجان بن رہا ہوں تو آپ وضاحت کر دیں" اس

نے تنک کر کہا۔

"ہاں! اسی لیے تو آئے ہیں — اب وضاحت سُن لیں — آپ کے خلاف ہمارے پاس مکمل ثبوت موجود ہے — آپ کے خاص ساتھی امیر خان دلاوری اور ان کی بیٹی نوری ان کو گرفتار کر لیا ہے — اور امیر خان نے ہمیں بہت سی کام کی باتیں بتائی ہیں"

"نن — نہیں" پہلی مرتبہ اس کا رنگ اُڑتا نظر آیا۔

"ہاں جناب! اور نورین او نے دادا فیروزی کے قتل کا اقرار کر لیا ہے — اس کا بیان ہے کہ ایسا کرنے کے لیے اس کے باس نے حکم دیا تھا اور باس آپ کے سوا کوئی نہیں"

"یہ کس طرح ثابت ہو گیا" اس نے جل کر کہا۔

"ہم ایک رُخ سے کام کرنے کے عادی نہیں ہیں — ہر رُخ سے کیس کا جائزہ لیتے ہیں اور کام کرتے ہیں — آپ کے اس محل نما مکان کے نیچے ایک بہت بڑا عظیم الشان تہ خانہ ہے — اس محل سے بھی زیادہ لمبا اور چوڑا — اس تہ خانے میں اربوں بلکہ کھربوں کا مال جمع ہے — سمگل شدہ مال — جو ملک کی منڈیوں اور دکانوں پر پہنچایا جاتا ہے — اب آپ کیا کہتے ہیں؟"

"یہ — یہ جھوٹ ہے — میرے اس محل کے نیچے کوئی

تھے — وہ تو شروع سے آخر تک آپ کے پاس رہے تھے —
آپ نے ہی ان کو چھپا دیا تھا — ورنہ آپ نیلے چاند کی موت
اپنے دوستوں کو کس طرح مارتے — پھر تو ہر کوئی آپ کی طرف
دوڑتا — کہ دینا جی ایک انجکشن — میرے گال میں چاند نکل آیا
ہے — اب جب کہ ان کے چوری ہونے کا ڈراما رچا لیا گیا
تو کوئی کس طرح مانگنے آتا — آپ اپنے تمام دوستوں کو باری
باری اس لیے ہلاک کر دینا چاہتے تھے کہ ان میں سے ایک
کو آپ کی حقیقت کا پتا چل گیا تھا — اور وہ لالچ میں آ
گیا — اس نے یہ بات پولیس کو تو بتائی نہیں ، آپ کو بلیک
میل کرنا شروع کر دیا — اب وہ خود پولیس کے پاس بھی نہیں
جا سکتا تھا آپ کے بارے میں بتانے — لہٰذا اپنا بچاؤ
آپ کرنے کے سوا اس کے پاس کوئی راستا نہیں تھا — آپ
کو یہ معلوم نہیں تھا کہ وہ کون ہے — صرف یہ معلوم تھا
کہ وہ ان میں سے ایک ہے — جو سیر میں آپ کے ساتھ
تھے — لہٰذا آپ نے فیصلہ کر لیا کہ سب کو نیلے چاند کے
ذریعے موت کے گھاٹ اتار دیں — اس سلسلے میں پہلا وار
آپ نے اپنے آپ پر کیا — تاکہ آپ پر شک نہ کیا جا سکے۔
اب آپ کیا کہتے ہیں؟"

" میں نہیں جانتا — نیچے کوئی تہ خانہ ہے — نہ میں نے

تہ خانہ نہیں ہے۔"

" اب شاید آپ کی عقل گھاس چرنے گئی ہے ، کیونکہ یہ
جھوٹ آپ کے کسی کام نہیں آئے گا۔"

" اگر اس کے نیچے کوئی تہ خانہ ہے تو میں اس سے واقف
نہیں ہوں — اس لیے کہ ہو سکتا ہے ، یہ ان معماروں نے کسی
کے اشارے پر بنایا ہو — جو یہاں محل تعمیر کرتے رہے
ہیں۔" سرابدال نے کہا۔

اس صورت میں پہلی بات تو یہ ہے کہ تہ خانے کا
کوئی راستا عمارت کے اندر نہیں کھلنا چاہیے — اگر کھلتا بھی
ہے تو بھی اس کے کھولے جانے کے آثار نہیں ہونے چاہییں۔
دوسرے یہ کہ اس کا دوسرا راستا ہونا چاہیے — جو دور کہیں
جا کر نکلے ، لیکن ایسی کوئی بات نہیں ہے — تہ خانے کا
راستا محل کے اندر ہی ہے — اور اس کو باقاعدہ استعمال کیا
جاتا رہا ہے — ابھی سب لوگوں کے سامنے ہم یہ بات
ثابت کریں گے — اور پھر..." انسپکٹر جمشید کہتے کہتے رک گئے۔

" اور پھر کیا؟" وہ جلدی سے بولا۔

" اور پھر یہ کہ نیچے وہ دس انجکشن بھی موجود ہیں — جو
ڈاکٹر داک سے حاصل کیے گئے تھے اور پھر جن کے چوری ہو
جانے کی خبر اڑائی گئی تھی — حالانکہ وہ چوری نہیں ہوئے

"وہ انگلش پیچھے رکھے ہیں" اس نے کہا۔

"بہت خوب۔ اب ایک آخری ثبوت۔ جس کو آپ کسی طرح بھی نہیں جھٹلا سکتے۔ اور آپ کی چیں بول جائے گی"۔ انسپکٹر جمشید نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

"انسپکٹر جمشید۔ تمیز سے"۔

"ملک دشمنوں سے میں اس سے زیادہ تمیز سے بات نہیں کر سکتا۔ اب ثبوت سن لیں۔ آپ کو اگر اس تہ خانے کے بارے میں کوئی علم نہیں ہے۔ اور آپ نے وہ تہ خانہ نہیں بنوایا اور آپ نے اس تہ خانے میں سمگلنگ کا مال نہیں رکھوایا اور آپ کبھی اس تہ خانے میں نہیں گئے تو پھر..." انسپکٹر جمشید کہتے کہتے رک گئے۔

"تو پھر کیا ؟؟؟" کئی آوازیں ابھریں۔

ان الفاظ کے ساتھ ہی سر ابدال خان نے اپنی جگہ سے چھلانگ لگائی اور دروازے سے باہر نکل گیا، لیکن فوراً ہی اسے اندر اچھال دیا گیا۔

"واپسی بھی اسی رفتار سے ہو گئی۔ بھئی واہ۔ انتظام ہو تو ایسا"۔

"ثبوت تو سن لیتے آپ۔ آئی بھی کیا جلدی تھی" محمود بولا۔

"ہاں اور کیا۔ میں کہہ رہا تھا کہ ..."

اس نے پھر چھلانگ لگائی اور اس مرتبہ انسپکٹر جمشید پر آیا، لیکن وہ ترچھے ہو گئے اور وہ دھڑام سے گرا۔

"ثبوت تو آپ کو سننا ہی پڑے گا جناب" فاروق مسکرایا۔

"بالکل! اس کے سوا کوئی چارہ نہیں۔ ثبوت یہ ہے کہ تہ خانے میں بے شمار چیزوں پر ان کی انگلیوں کے نشانات ہیں"۔ انسپکٹر جمشید نے کہا۔

"اوہ۔ اوہ" بہت سی آوازیں ابھریں۔

"شوق سے جتنے جی چاہے اوہ منہ سے نکالیے، ہمیں کوئی اعتراض نہیں" فاروق بول اٹھا۔

"یار چپ رہو۔ مجھ پر جملے چھوڑے جا رہے ہو" محمود نے جھلا کر کہا۔

"تو اور کیا کروں۔ اس موقعے پر تو یہی کچھ کر سکتا ہوں۔ عقل کے ناخن لو بڑے بھائی"۔

"وحشت تیرے کی" محمود نے جھلا کر اپنا ہاتھ ران پر مارا۔

"آئیے صاحبان۔ آپ کو تہ خانے کی سیر کرا دوں"۔

"تہ خانے کی سیر۔ بھئی واہ۔ یہ تو کسی ناول کا نام ہو سکتا ہے" فاروق چہکا۔

"تو رکھوا لو کسی ناول نگار سے یہ نام" فرزانہ نے جھلا کر کہا۔

انسپکٹر جمشید تہ خانے کے دروازے کی طرف بڑھ گئے۔

محمود، فاروق اور فرزانہ سب کچھ انہیں بتا چکے تھے — باقی لوگ بھی اُٹھ کر ان کے پیچھے چل پڑے — سر ابدال خان کے گرد سادہ لباس والے گھیرا ڈال چکے تھے — محمود، فاروق اور فرزانہ بُتوں کے بُت بیٹھے رہے —

"تم نہیں چلو گے؟" پروفیسر داؤد نے پوچھا۔

"جی نہیں — ہم کیا کریں گے جا کر۔"

"اور یہاں کیا کرو گے بیٹھ کر۔" خان رحمان نے منہ بنایا۔

"جی یہاں — یہاں بیٹھ کر یہ فیصلہ کریں گے کہ اس کیس کا سہرا کس کے سر رہا۔"

اور پروفیسر داؤد اور خان رحمان کھی کھی کرتے دوسرے لوگوں کے پیچھے چلنے لگے —